اور باقاعدہ دعوتِ اسلام دینے اور ان پر دینِ ربانی اور مذہب الٰہی پیش کرنے کی حجت تمام کرنے کے بعد آپ نے دعوت و تبلیغ کا دوسرا منطقی قدم اٹھایا اور ایک دن کوہ صفا پر چڑھ کر نام بنام تمام قریشی قبیلوں اور مکہ والوں کو پکارا اور جب ان کے کافی اور نمائندہ لوگ جمع ہو گئے تو آپ نے ان کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی اور اس موقع پر وہ خطبہ ارشاد فرمایا جو مشہور ہونے کے علاوہ بڑا مؤثر بھی ہے۔ دعوت و تبلیغ نبوی کا یہ ایک اہم ترین مرحلہ اور مؤثر ترین طریقہ تھا کہ اس طریقہ سے آپ نے اپنے شہر کے تمام طبقات کے سامنے واشگاف انداز میں اسلام کی دعوت پیش کر دی تھی اور اپنے خاندان اور اعزہ کے ساتھ ساتھ سب کو خطاب عام کیا تھا۔ ہمارے مآخذ میں اس خطبۂ نبوی اور دعوتِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کئی روایات ملتی ہیں اور ہمارے محققین علماء و سیرت نگاران میں سے صحیح ترین روایت کا انتخاب اور بقیہ کی تردید میں لگ جاتے ہیں بلاشبہ صحیح کی تلاش اور غلط کی تردید بھی ایک اہم کام ہے۔ لیکن ان روایات کی یہ توجیہ بھی کی جاسکتی ہے اور وہ خاص منطقی ہی نہیں بلکہ دوسری روایات و قرائن اور شواہد کی مصدقہ بھی ہے کہ یہ مختلف روایات مختلف و متعدد مواقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ عام اور تبلیغ علانیہ کی نمائندگی کرتی ہیں اور ان کا تعلق صرف ایک واقعۂ دعوت و تبلیغ سے نہیں ہے۔ اس حقیقت مسلمہ سے کوئی انکار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تسلسل و تواتر کے ساتھ بلکہ جان کھپا کر تبلیغ و دعوت کا کام کرتے تھے اور جس کی شہادت خود قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے دی بلکہ آپ کو اجد مشقت اور جان ہلاکت میں ڈالنے سے مربیانہ اور والہانہ نصیحت بھی فرمائی۔ لیکن آپ کا جذبۂ خیر، شوق تبلیغ اور جوشِ دعوت اتنا بڑھا ہوا اور بیکراں تھا کہ ہر قیمت پر جلد از جلد سب لوگوں تک اسلام پہونچانے اور ان کو دائرہ ایمان میں لانے کی سعی بلیغ کرتے رہے۔ ان شواہد و مسلمات کی روشنی میں یہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے خاندان اور رشتہ داروں کی طرح مکہ والوں کو بھی بار بار کوہِ صفا سے، مسجدِ حرام سے اور دوسرے عوامی مقامات سے پکارا تھا اور خیر کی طرف بلایا تھا۔[۲۳]

علانیہ دعوت و تبلیغ کے دو اہم ترین اقدامات اور طریقوں کے علاوہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خفیہ تبلیغ کے دور کا مؤثر ترین طریقہ یعنی افراد و طبقات سے

شخصی ملاقاتوں اور ان ملاقاتوں میں دعوت وارشاد کرنے کا سلسلۂ خیر بھی جاری رکھا۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح قبائل عرب کو اللہ تعالیٰ اور اسلام کی طرف دعوت دینا شروع کی آنحضرت مختلف قبائل کے پاس بہ نفس نفیس تشریف لے جاتے اور جو ہدایت ورحمت اللہ کی طرف سے آپ کے پاس آتی اسے لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے۔" اسی طرح مکہ مکرمہ میں جو شخص خواہ قابل ذکر ہو یا نہ ہو جزیرہ نمائے عرب کے کسی بھی مقام، علاقہ یا گوشہ سے آتا آپ اس سے ملتے اور اسے اللہ کا دین پہونچاتے آپ شب وروز ہر وقت اور ہر آن خفیہ اور علانیہ دعوت دیتے اور کسی کے روکے نہ رکے۔ آزاد وغلام، ضعیف وقوی، غنی وفقیر غرض کہ ہر طبقہ اور زمرہ کے لوگوں سے ملتے اور اللہ کی طرف بلاتے۔ عام طور سے سیرت نگار خاص کر جدید مورخین آپ کی دعوتِ عام اور قبائل عرب وافراد وطبقات سے ملاقاتوں کے سلسلہ میں یہ تاثر دیتے ہیں کہ یہ کام آپ نے مکی دور کے اواخر میں کیا خاص کر حضرت خدیجہ اور جناب ابو طالب ہاشمی کی وفات کے بعد اور غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے قدیم سیرت نگار و مورخین عام الحزن (سال اندوہ) کے بعد ہی قبائل سے آپ کی ملاقات ودعوت کی سرخی لگا کر یہ حقیقت متواتر وپیہم بیان کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کے بیان میں یہ وضاحت سے آتا ہے کہ علانیہ تبلیغ یا انذار عام کے حکم الٰہی کے بعد آپ نے ہر سال قبائل سے مواسم حج میں اور مختلف مقامات پر ملاقات کی اور ان کو دعوت دی۔ البتہ بعض جدید سیرت نگاروں نے تبلیغ نبوی کے اس طریقہ کی حقیقت پائی تھی اور ان میں سے ایک مولانا مودودی بھی ہیں جو لکھتے ہیں "اپنے خاندان اور قبیلے کے لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچانے سے فارغ ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ اور عرب کے لوگوں میں عام تبلیغ کا سلسلہ شروع کیا اور جب تک آپ مکہ میں مقیم رہے دس سال مسلسل ہر حال میں اور ہر جگہ لوگوں کو قرآن سناتے اور اللہ کا دین قبول کرنے کی دعوت دیتے رہے۔" اس بیان میں صرف یہ تبدیلی کرنی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ خاندان اور قبیلے اور مکہ کے تمام لوگوں کے ساتھ ساتھ آپ کی تبلیغ کا سلسلہ جاری رہا نہ کہ ان کو تبلیغ سے فراغت کے بعد کیونکہ تبلیغ ودعوت سے فراغت تو آپ کو تادم آخر نہیں ہوئی بیرونی افراد وطبقات سے تو آپ کی ملاقات اور ان کو اسلام کی تبلیغ ودعوت

خاص خاص مواقع اور کبھی کبھی ہوتی تھی لیکن قریش اور دوسرے طبقاتِ مکہ سے تو آپ کا دن رات کا واسطہ تھا لہٰذا ان کو کسی حال میں نظر انداز کرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ آپ ان کے عوام و خواص سے ہر حال اور ہر مقام پر ملتے اور ان کو دعوت دیتے تھے۔ اس مسلسل اور پیہم کی دعوت و تبلیغ میں آپ نے ایک اہم طریقہ اور سلیقہ یہ نکالا کہ قریشی اکابر کی مجلسوں (اندیہ/مجالس) میں جہاں اکابر کے ساتھ ساتھ ان کے قبیلہ/گروہ کے عام و خاص لوگوں کی خاصی تعداد موجود ہوتی تھی تشریف لے جاتے اور ان کے سامنے دین کی دعوت اور اسلام کی تعلیمات پیش فرماتے۔ مدتِ دراز سے قریشی اکابر خانۂ کعبہ کے اردگرد مسجدِ حرام کے صحن میں اپنی اپنی مخصوص مجلسیں اور محفلیں جمایا کرتے تھے۔ سماجی، تہذیبی اور سیاسی لحاظ سے یہ قریشی مجالس بہت اہم ہوا کرتی تھیں، کیونکہ ان میں ہر طرح کے امور خاص کر قبائلی اور قومی معاملات زیرِ بحث آتے تھے۔ تبلیغ اسلام اور دعوتِ حق کے لیے بھی یہ قومی/قبائلی مجالس بہت اہم تھیں اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے بھرپور فائدہ اٹھاتے تھے۔ قرآن مجید کی سورۂ علق کی آیتِ کریمہ ۱۷ فلیدع ناديه (اب بلا دے اپنی مجلس کو) میں جس نادی/مجلس کا ذکر ہے مفسرین کے خیال و توضیح میں وہ ابوجہل مخزومی کی مجلس اور اہلِ مجلس کی طرف کنایہ ہے[۵۴] اور اس کا تعلق اظہار و اعلانِ اسلام کے اولین واقعہ سے ہے جب آپ نے علانیہ دعوتِ دینی شروع بھی نہ کی تھی، صرف بر سرِ عام مسجدِ حرام کے صحن میں علانیہ نماز ادا کر کے اپنے دینِ حق کا اعلان ہی کیا تھا۔ بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ علانیہ تبلیغ کے دس سالہ دورِ مکی میں آپ نے مسلسل اور برابر اور اپنی ہجرتِ مدینہ تک قریشی اکابر کی مجالس و محافل میں تشریف لے جا کر ان کو طرح طرح سے دینِ حق کی طرف بلایا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ قریشی مجالس بھی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ کے دین کے ذکر سے خالی نہ ہوتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا جس کا اکابرِ قریش کے ذہنوں پر اثر پڑنا لازمی تھا اور اکثر و بیشتر ان کی مجالس میں اسلام اور پیغمبرِ اسلام کا ذکر کسی نہ کسی طور سے ضرور آتا تھا۔ دعوتِ نبوی کے طریقوں کے تجزیہ میں ان مجالس[۵۵] پر ذرا مفصل بحث کرنی ضروری معلوم ہوتی ہے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی تیز رفتار کامیابی اور اشاعت سے

قریشی اکابر حیران و پریشان تھے ہی کہ حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمی جو آپ کے چچا اور رضاعی بھائی بھی تھے کہ قبولِ اسلام کی خبر اور واقعہ نے ان کو کافی تشویش میں مبتلا کر دیا۔ بعض دور رس اور دور بیں اور معاملہ فہم اکابرِ قریش اس مشکل سے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ حضرت حمزہ کے قبول اسلام کے متصل زمانہ میں ایک دن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام میں اکیلے تشریف فرما تھے اور کچھ فاصلہ پر اکابر قریش کی مجلس جمی تھی جس میں ایک عظیم سردار قریش عتبہ بن ربیعہ بھی موجود تھا۔ اس نے اہل مجلس کو مخاطب کر کے تجویز رکھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کی جائے اور ان کے سامنے کچھ تجاویز رکھی جائیں شائد وہ ان کو قبول کریں اور ہم بھی ان کو مان لیں تاکہ وہ ہمیں معاف کر دیں۔ عتبہ اپنی مجلس سے اٹھ کر آپ کے پاس آیا اور اسلام کی لائی ہوئی سماجی اور قبائلی اتھل پتھل کا ذکر کر کے آپ کے سامنے اپنی وہ تجاویز رکھیں جو بہت مشہور ہیں یعنی اگر آپ اپنی دعوت کے ذریعہ مال اکٹھا کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو ہم اتنا مال دیں کہ سب سے زیادہ مالدار بن جائیں۔ اگر شرف وسیادت درکار ہے تو آپ کو سید قریش بنالیں، اگر بادشاہت مقصود ہے تو آپ کو اپنا بادشاہ تسلیم کرلیں اور اگر کوئی عارضہ لاحق ہو گیا ہے جس کا علاج نہیں ہو رہا تو ہم اس کا کامل علاج کرادیں۔ عتبہ بن ربیعہ جب اپنی تجاویز پیش کر چکا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سامنے سورہ حم سجدہ/فصلت کی آیات تلاوت کیں اور سجدہ تلاوت والی آیت پر پہونچ کر سجدہ کیا۔ عتبہ مبہوت و ششدر سنتا رہا اور جب آپ نے سجدہ کیا تو وہ بھی خود فراموشی میں حضور الٰہی میں سجدہ ریز ہو گیا۔ بعد میں آپ نے فرمایا کہ تم نے میری بات سن لی اب تم خود فیصلہ کرلو۔ عتبہ واپس مجلس قریش میں گیا تو سب نے اس کے بدلتے رنگ اور حال کو پہچان لیا۔ اس ملاقات اور کلام الٰہی کی سماعت کا اس پر یہ اثر ہوا کہ اس نے اہل مجلس کو مشورہ دیا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی دعوت کو ان کے حال پر چھوڑ دو اور ان سے تعرض نہ کرو۔ بلاشبہ وہ عظیم امر ہے۔ اگر عربوں کے ہاتھوں آپ قتل ہوتے ہیں تو تمہارا کام بغیر تمہارے کیے ہو جائے گا اور اگر وہ عرب پر غالب آتے ہیں تو آپ کا ملک تمہارا ملک (شاہی) اور آپ کی عزت تمہاری عزت ہوگی اور تم تمام لوگوں میں سب سے زیادہ خوش بخت ہوگے۔ اگرچہ اکابر قریش نے عتبہ کا مشورہ ان کی مسحوریت پر محمول کر کے نہ مانا لیکن کیا دعوتِ نبوی کے اثرات اور اسلام کے متوقع غلبہ کا ان کو احساس نہ ہوا ہوگا؟

عتبہ بن ربیعہ کے اعترافات میں اسلام کی حقانیت اور کامیابی دونوں مشہور تھیں اور قریشی اکابر پر ظاہر بھی تھیں۔[۴۷]

ابن اسحاق وغیرہ سیرت نگاروں نے ایک اور مجلس قریش کا ذکر کیا ہے جس میں تمام اکابر قریش جیسے عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ابوسفیان بن حرب، نضر بن حارث، ابوالبختری بن ہشام، اسود بن مطلب، زمعہ بن اسود، ولید بن مغیرہ، ابوجہل بن ہشام، عبداللہ بن ابی امیہ، عاص بن وائل، امیہ بن خلف اور حجاج سہمی کے دو فرزند نبیہ اور منبہ اور متعدد دوسرے موجود تھے۔ یہ مجلس غروب آفتاب کے بعد صحن مسجد میں اور زیر سایۂ کعبہ منعقد ہوئی اور بحث مباحثہ کے بعد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا گیا ہے۔ آپ فوراً تشریف لائے کیونکہ آپ ان کو مسلمان بنانے اور ان تک دعوتِ حق پہونچانے کے حریص تھے۔ انھوں نے بھی عتبہ بن ربیعہ کی تجاویز پیش کیں تاکہ آپ اپنے کام اور دعوت سے باز آجائیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مطالبات و تجاویز کے مقابلہ میں اپنی دعوت توحید و رسالت و آخرت پیش کی لیکن وہ کٹ حجتی پر اتر آئے اور طرح طرح کے مطالبات اور تمسخر آمیز تقاضے کرنے لگے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعوت پہونچا کر اور ان کے اسلام سے مایوس ہو کر مجلس سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسی مجلس کے خاتمہ پر عبداللہ بن امیہ مخزومی نے آپ کے ساتھ چل کر مزید مطالبات پیش کیے جن کا ذکر بعض آیات قرآنی میں آیا ہے اور اسی مجلس کے آخر میں ابوجہل مخزومی نے آپ کے قتل کا ارادہ باندھا اور دوسرے دن اس نے اس ارادہ کو عملی روپ دینا چاہا، جب آپ نماز میں سجدہ میں گئے اور اکابر قریش اپنی اپنی مجالس میں دیکھتے رہے کہ وہ ایک بھاری پتھر سے آپ کا سر کچلنا چاہتا ہے۔ لیکن وہ اچانک خوفزدہ ہو کر پلٹا اور اہل مجلس کو بتایا کہ ایک خوفناک اونٹ نے مجھ پر حملہ کر دیا تھا اور مجھے کھانے دوڑا تھا۔ ظاہر ہے کہ آپ کے کلام، دعوت اور اس معجزہ نے قریشی اکابر کو بہت کچھ سمجھایا ہوگا۔[۴۸] اس کی تصدیق ایک دوسری مجلس قریش سے ہوتی ہے جس میں نضر بن حارث نے آپ کے ساحر، شاعر، کاہن و مجنوں ہونے سے انکار کر کے آپ کے اوصاف حمیدہ کا اقرار کیا تھا لیکن وہ بھی اپنے اعترافات کے باوجود مجلس نبوی کے بالمقابل اپنی مجلس جماتا اور اس میں ایرانی قصے سناتا تھا تاکہ قریش کی توجہ آپ کی دعوت سے ہٹائے رکھے۔[۴۹] ایک اور قریشی مجلس میں آپ سے متعدد سوالات پوچھے گئے تھے

جو ان کے نمائندے مدینہ کے یہودی علماء سے پوچھ کر آئے تھے تاکہ آپ کی نبوت کی صحت جانچ سکیں۔ آپ نے ان کے جواب میں آیاتِ قرآنی سنائیں اور ان پر حق واضح کر دیا۔ اعتراف حق تو ان کو تھا لیکن وہ اس کا اقرار نہ کرتے تھے۔[۵]

آخری مجلسِ قریش میں جو سوالات قریش نے اٹھائے تھے وہ بہت بنیادی تھے اور ان سے زیادہ اہم ان کے جوابات نبوی تھے جو آیاتِ الٰہی اور کلام ربانی کی صورت میں ان کو دئے گئے تھے۔ قریش نے مدینہ منورہ کے یہودی علماء سے پوچھ کر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اصحاب کہف، ذوالقرنین اور روح کے بارے میں سوالات کیے تھے۔ روایت کے مطابق آپ نے ان سے دوسرے دن جوابات دینے کا وعدہ کیا مگر وحی الٰہی نہ آنے کے سبب پندرہ دن تک جوابات نہ دے سکے۔ ظاہر ہے کہ آپ کو رنج وحزن ہوا اور قریشی اکابر کو مذاق اڑانے کا موقع ملا۔ بالآخر آپ نے ان کو سورۂ کہف ان کے سوالات کے جواب میں سنائی جس سے آپ کی پریشانی اور قریش کی فتنہ انگیزی ختم ہوئی اگرچہ اس دعوتی طریقہ میں الٰہی کارفرمائی تھی تاہم اس میں یہ اہم حقیقت بھی مضمر تھی کہ معترضین کے اعتراضات کا فوری جواب دینا ہر موقع ومحل پر ضروری نہیں۔ ایسا دیکھا گیا ہے کہ اعتراض وجوابِ اعتراض دونوں میں جذبات کا اشتعال، مخالفانہ رویہ مناظرانہ انداز زیادہ ہوتا ہے اور افہام وتفہیم کا جذبہ کم یا سرے سے مفقود۔ مختصر مدت کے بعد قریشی مناظرانہ رنگ کم ہوگیا اور افہام وتفہیم کی صورت زیادہ پیدا ہوئی تو ان کے سوالات کا بڑا عالمانہ اور مدلل جواب دیا گیا جس نے نہ صرف ان کو خاموش کیا بلکہ اعترافِ حق پر بھی مجبور کیا، اگرچہ انھوں نے اس کا برملا اعتراف نہ کیا اور دوسری حکمتوں کے علاوہ تاخیرِ جواب میں ایک مصلحت وحکمت یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ قریش کو زیادہ تر آپ کی رسالت اور آپ کے پیغام پر اعتراض تھا۔ اس عرصہ میں قریش آپ کو مسلسل ہر حال میں اور ہر آن میں دیکھتے رہے تھے۔ آپ کو چلتے پھرتے، دعوت دیتے، مسجدِ حرام میں نماز پڑھتے اور عبادت کرتے، لوگوں سے ملتے جلتے، غرضکہ زندگی کو معمول کے مطابق گذارتے دیکھتے رہے۔ پھر یکایک آپ نے ان کے اعتراضات کو دور کیا اور ان کے سوالات کا جواب دیا۔ اس واقعہ نے قریش اور تمام دوسرے منکرین پر دوسری حقیقت واضح کی کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں اور جو کچھ کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ

کی جانب سے ہوتا ہے، آپ کی اپنی طرف سے نہیں۔ اگر وہ آپ کے ذہن کا ساختہ پرداختہ ہوتا تو آپ وعدہ کے مطابق دوسرے دن ان کے جوابات فراہم کر دیتے۔ تاخیر نے واضح کیا کہ آپ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں اور آپ کا کلام کلام ربانی ہے۔

غیب کی خبروں کے علاوہ بعض عقلی دلائل اور وجوہ بھی ان مجالس قریش میں زیر بحث آتے تھے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے دلائل و براہین کا جواب بھی دیتے تھے۔ ایک مجلس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ولید بن مغیرہ اور متعدد دوسرے اکابر قریش کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ اسی دوران نضر بن حارث آگیا اور اس نے آپ سے حجت شروع کر دی لیکن آپ نے اس کو اپنے کلام و دلائل سے خاموش کر دیا غالباً یہ بحث اللہ کی عبادت اور صنم پرستی سے متعلق تھی کیونکہ آپ نے اس مجلس کے اختتام پر سورۂ انبیاء کی تین آیات ۹۸-۱۰۰ پڑھی تھیں:۔

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ	تم اور جو کچھ تم پوجتے ہو اللہ کے سوا،
اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ اَنْتُمْ لَهَا وَارِدُوْنَ ۝	جھونکنا ہے دوزخ میں۔ تم کو اس پر پہونچنا
لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ؕ	ہے اگر ہوتے یہ لوگ ٹھاکر (جھوٹے الٰہ) نہ
وَكُلٌّ فِيْهَا خَالِدُوْنَ ۝ لَهُمْ فِيْهَا	پہونچتے اس پر اور سارے اس میں پڑے
زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ۝	رہیں گے۔ ان کو وہاں چلّانا ہے اور وہ
	اس میں بات نہیں سنتے۔

آپ کے تشریف لے جانے کے بعد عبداللہ بن زبعریٰ سہمی آیا اور جب اس کو آپ کی باتوں اور کلام الٰہی کی خبر دی گئی تو اس نے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ پوچھو کہ سب چیزیں جن کی ہم پوجا کرتے ہیں اللہ کے سوا وہ جہنم میں اپنے پوجا کرنے والوں کے ساتھ ہوں گی؟ ہم ملائکہ کی عبادت کرتے ہیں، یہود عزیر کو پوجتے ہیں اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ بن مریم کی پرستش کرتے ہیں۔ ولید بن مغیرہ، نضر بن حارث اور تمام اکابر قریش عبداللہ بن زبعریٰ کے دلائل سے بہت خوش ہوئے اور سمجھے کہ آپ پر نہ صرف حجت تمام کر دی بلکہ آپ کو لاجواب بھی کر دیا۔ جب آپ کو علم ہوا غالباً دوسری مجلس میں تو آپ نے فرمایا کہ اللہ کے سوا دوسری چیزوں/شخصوں کی عبادت کرنے والوں کے ساتھ جہنم میں وہی معبودان باطل جائیں گے جو اس عبادت کو پسند کرتے ہیں۔ وہ تو

شیاطین کی عبادت کرتے ہیں یا جن کی وہ ہدایت کرتے ہیں صرف ان کی عبادت کرتے ہیں"۔ انھیں کے ضمن میں سورہ مذکورہ بالا کی اگلی آیات نازل ہوئیں :

اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَھُمْ مِنَّا	جن کو آگے ٹھہر چکی ہماری طرف سے
الْحُسْنٰی اُولٰٓئِکَ عَنْھَا مُبْعَدُوْنَ ۝	نیکی وہ اس سے دور رہیں گے نہیں سنتے
لَا یَسْمَعُوْنَ حَسِیْسَھَا وَھُمْ فِیْمَا	اس کی آہٹ، اور وہ اپنے جی کے مزوں
اشْتَھَتْ اَنْفُسُھُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ (۲۱:۱۰۱-۱۰۲)	میں سدا رہیں گے۔

اس طرح آپ نے قریشی دلائل کا مسکت جواب فراہم کرکے ان پر توحید الٰہی اور شرک کی حقیقت پوری طرح واضح کردی[۵۱]

قریش نے جب یہ دیکھا کہ آپ توحید الٰہی چھوڑنے والے نہیں ہیں تو انھوں نے ایک دوسری مجلس میں جس میں ولید بن مغیرہ، اسود بن مطلب، امیہ بن خلف اور عاص بن وائل موجود تھے مشترکہ عبادت اور مشترک معبود کی تجویز رکھی کہ آپ ہمارے معبودوں کی عبادت کریں اور ہم آپ کے معبود کی۔ آپ نے ان کی تجویز کے جواب میں سورہ کافرون سنادی اور ان کی تجویز کی حقیقت ان کو دکھلادی[۵۲]۔ ایک اہم مجلس قریش کا ذکر دعوت نبوی کے سلسلہ میں ضروری ہوجاتا ہے کیونکہ اسلام دعوت وتبلیغ کے لیے ایک اصول وقاعدہ بھی مقرر کرتا ہے اور اس کی صحیح سمت ورفتار بھی متعین کرتا ہے۔ ایک بار ولید بن مغیرہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ موجود تھا اور آپ اس سے کلام کر رہے تھے۔ آپ کو امید اور آرزو تھی کہ شاید وہ اسلام قبول کرلے۔ وہ قریش کے عظیم ترین سرداروں میں سے تھا اور اس کے قبول اسلام سے اسلام اور دعوتِ اسلامی کو مکہ مکرمہ میں بہت تقویت پہونچتی۔ اسی دوران حضرت ابن ام مکتوم جو نابینا مسلمان تھے آپ کی مجلس سے گذرے تو آپ سے کلام کرکے قرآن پڑھنے کی درخواست کرنے لگے۔ آپ کو بہت شاق گذرا کیونکہ ولید بن مغیرہ کے اسلام کی دعوت دینے میں خلل پڑا تھا۔ آپ نے اپنی ناگواری کا اظہار کیا تو حضرت ابن ام مکتوم مایوس چلے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے فوراً سورہ عبس نازل کی اور آپ کو ہدایت کی کہ آپ کی دعوت کسی کے لیے خاص نہیں بلکہ عام ہے۔ جو چاہے اس کو منع نہ کریں اور جو نہ چاہے اس کے پیچھے اس طرح نہ پڑیں کہ خواہشمند نظرانداز ہوجائے[۵۳]۔ اس اصول دعوتِ اسلامی سے یہ واضح ہوتا ہے کہ داعی ہر حال میں

آرزومند مدعو کی رعایت کرے اور اس کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کرے، سماجی اور سیاسی لحاظ سے بڑے اور چھوٹے مدعوئین کے درمیان فرق نہ کرے اور بڑے کے لیے چھوٹے کو نظر انداز نہ کرے اور کسی کے استفسار و سوال پر ناگواری نہ محسوس کرے اور نہ اس کا اظہار کرے کہ دعوت اسلامی خوش خلقی، بردباری، حلم و تدبر اور ہمہ وقتی تیاری کا تقاضا کرتی ہے۔ اگرچہ متعدد دوسری مجالس قریشی کا ذکر مآخذ میں ملتا ہے مگر ان کا زیادہ تر تعلق دوسرے امور اور واقعات سیرت سے ہے۔ آخر میں ایک مجلس قریش کا ذکر مختصراً کرنا ضروری ہے کیونکہ اس میں حبشہ کے بیس نصاریٰ کے اسلام قبول کرنے کا ذکر ہے جو قریشی اکابر کی مجالس کے عین سامنے پیش آیا تھا۔[۵۹] دعوتِ اسلامی اور اس کی ترقی میں مجالس قریش نے کافی اہم کردار ادا کیا تھا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقۂ دعوت سے بہت فائدہ اٹھایا تھا۔

(باقی آئندہ)

تعلیقات وحواشی

۱؎ عبدالملک ابن ہشام (م ۲۱۸ھ)، سیرۃ النبی، مرتبہ محمد محی الدین عبدالحمید، دار الفکر قاہرہ ۱۹۳۷ء، اول ص ۷۵-۲۵۹ و مابعد؛ ابن سعد (م ــــــ) الطبقات الکبریٰ، دار صادر بیروت ۱۹۵۷ء، اول ص ۱۹۹؛ بلاذری (م ۲۸۹ھ) انساب الاشراف، قاہرہ اول ۱۹۵۹ء، ص ۸-۱۱۵ نیز ملاحظہ ہو: مولانا شبلی، سیرت النبی، دار المصنفین اعظم گڑھ ۱۹۸۳ء، اول ص ۱-۲۰۶؛ مولانا محمد ادریس کاندھلوی، سیرۃ المصطفیٰ، دار الکتاب دیوبند (غیر مورخہ)، اول ص ۲-۱۴۷، ۱۵۱ و مابعد؛ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، سیرت سرورِ عالم، ادارہ ترجمان القرآن لاہور ۱۹۸۰ء، دوم ص ۶۲-۱۴۳ اور ص ۵۱۲-۹۳م

۲؎ ابن ہشام اول ص ۷-۲۶۴ نے اس موضوع پر سرے سے بحث ہی نہیں کی ہے۔ مولانا شبلی اول ص ۱-۲۰۵ نے بھی اس سے گریز کیا ہے۔ مولانا ادریس کاندھلوی، اول ص ۷-۱۵۵ نے بھی مولانا شبلی کا اتباع کیا ہے۔ مولانا مودودی، دوم ص ۱۴۶ نے لکھا ہے کہ "قبل از وقت مخالفت شروع ہو جاتی۔"

۳؎ خفیہ تبلیغ و اشاعتِ اسلام کے سہ سالہ دور کے مصالح، اسباب اور مقاصد پر ابھی تک کوئی اہم تحقیقی اور مدلل کام نہیں ہوا۔ مآخذ و مصادرِ سیرت کے علاوہ کتبِ احادیث میں اس موضوع پر کافی مواد مل سکتا ہے

۴؎ اس موضوع پر صرف مولانا مودودی، دوم ص ۱۴۷ نے مفصل و مدلل بحث کی ہے "..... سورۂ علق کی پہلی پانچ آیات صرف یہ ظاہر کرتی تھیں کہ آپ پر نزول وحی کا آغاز ہو گیا ہے اور آپ اللہ کی طرف سے نبی بنا دیے گئے ہیں۔ اب سورۂ مدثر کی ان آیات میں آپ کو نبوت کے ساتھ ساتھ فریضۂ رسالت بھی سونپ دیا

گیا اور حکم دیا گیا کہ آپ اٹھ کر اس فرض کو ادا کرنا شروع کردیں۔" مفسرین نے بالعموم اس سورت کے ضمن میں تبلیغ نبوی کا ذکر کیا ہے۔ شاہ عبدالقادر دہلوی فرماتے ہیں: "یہ سورت اتری تب خلق کو دعوت کا حکم ہوا۔" مولانا مودودی کی عبارت حافظ ابن کثیر کے الفاظ کا ترجمہ ہے: "وبھذا حصل الارسال کما حصل بالاول النبوۃ" تفسیر القرآن، عیسی البابی الحلبی قاہرہ (غیر مورخہ) چہارم ص۴۴۰

۵۔ سورہ مدثر کی ابتدائی آیات ہیں: یا ایہا المدثر ۝ قم فانذر ۝ وربک فکبر ۝ وثیابک فطہر ۝ والرجز فاھجر ۝ ولا تمنن تستکثر ۝ ولربک فاصبر ۝ اے لحاف میں لپٹے اٹھ کھڑا ہو، پھر ڈر سنا، اور اپنے رب کی بڑائی بول، اور اپنے کپڑے پاک رکھ، اور گندگی کو چھوڑ دے، اور نہ کر کہ احسان کرے اور بہت چاہے اور اپنے رب کی راہ دیکھ۔ (ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی)

۶۔ مثال کے طور پر سورہ انعام ۱۹، ابراہیم ۴۴، شعراء ۲۱۴، مریم ۳۹ اور نوح ۱۰ وغیرہ میں آپ کو حکم دیا گیا ہے کہ اپنی قوم اور تمام انسانوں کو انذار کریں۔ بنیادی طور سے یہ آپ کا فرض منصبی تھا کہ آپ رسول اللہ تھے۔ لیکن امت مسلمہ پر یہ فرض امر بالمعروف کے ضمن میں عائد ہوتا ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صریح حکم کے تحت کہ میری جانب سے تبلیغ کرو خواہ ایک آیت کی ہو۔" اس لیے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں بھی یہ مسلمانوں کا فریضہ تھا اور آپ کی وفات کے بعد اس کی اہمیت دوچند ہوگئی ہے۔

۷۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں ذکر آتا ہے کہ انھوں نے حضرت خدیجہ کے ساتھ آپ کو نماز پڑھتے دیکھ کر استفسار کیا تو آپ نے فرمایا: یہ اللہ کا دین ہے جس کو اس نے اپنے لیے پسند فرمایا ہے اور جس کے ساتھ اس نے اپنے رسول بھیجے ہیں۔ لہٰذا میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ اللہ وحدہ لاشریک کو مانو اور اس کی عبادت کرو اور لات و عزیٰ کا انکار کردو۔" حضرت علی نے ایک رات توقف کے بعد اسلام دوسرے دن دوبارہ استفسار اور دعوتِ نبوی پر اسلام قبول کیا۔ ملاحظہ ہو: ابن اسحاق، کتاب المبتدا والمبعث والمغازی، مرتبہ محمد حمید اللہ، اردو ترجمہ نور الٰہی ایڈوکیٹ، نقوش رسول نمبر ۱۱، لاہور ۱۹۸۵ء، باب ۱۶ ص ۱۳۰؛ ابن کثیر۔ مولانا مودودی، دوم ص ۱۴۴؛ ادریس کاندھلوی، اول ص ۱۵۵ دونوں نے ابن کثیر کی البدایہ کا حوالہ دیا ہے۔

ابن اسحاق کے تہذیب و تلخیص کرنے والے ابن ہشام نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت علی کے نماز پڑھنے کا ذکر کیا ہے اور ایمان لانے کا بھی مگر دعوتِ نبوی کی مذکورہ بالا روایت و دعوت کا ذکر نہیں کیا۔ ملاحظہ ہو ابن ہشام اول ص ۲۶۴-۵۔ مولانا شبلی اول ص ۲۰۵ نے نبوی دعوت پر حضرت علی کے ایمان لانے کا یہ واقعہ نہیں بیان کیا۔

حضرت زید بن حارثہ کلبی کے اسلام قبول کرنے کے حالات و واقعات اور دعوتِ نبوی کا ذکر نہیں ملتا۔ غالباً وہ بھی حضرت علی کی مانند اسلام لائے ہوں گے جیسا کہ مولانا مودودی دوم ص ۱۴۵ کا خیال ہے۔ دوسرے

سیرت نگاروں نے ان کے قبول اسلام کا ذکر ضرور کیا ہے ملاحظہ ہو ابن ہشام اول ص۲۶۵ ؛ مولانا شبلی، اول ص۲۰۵ ؛ ادریس کاندھلوی، اول ص۱۵۶ ۔

۸ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں یہ صراحت ملتی ہے کہ اولین وحی کی تنزیل کے بعد ہی بلا دعوت مسلمان ہوگئی تھیں اور اولین مسلم تھیں۔ ملاحظہ ہو: ابن اسحاق ص۱۳۱-۱۳۲ ؛ ابن ہشام اول ص۲۵۹-۲۶۷ ؛ مولانا شبلی، اول ص۲۰۵ ؛ ادریس کاندھلوی، اول ص۱۵۴-۱۵۵ ؛ مودودی دوم ص۱۴۳ ۔

۹ زرقانی نے شرح مواہب میں لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر حضرت خدیجہ کے بھتیجے حکیم بن حزام اسدی کے گھر بیٹھے تھے کہ اسی دوران حضرت حکیم کی باندی نے آکر خبر دی کہ حضرت خدیجہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت موسیٰ کی مانند اللہ کا نبی بتاتی ہیں۔ حضرت ابوبکر نے یہ سن کر خدمتِ نبوی میں حاضری دی اور بلا تامل ایمان لے آئے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکر نے آپ سے ملاقات کرکے آپ کی نبوت و رسالت کی تصدیق چاہی تو آپ نے فرمایا..... "بیشک میں اللہ کا رسول اور اس کا نبی ہوں تاکہ اس کا پیغام پہونچاؤں۔ میں تمہیں بھی اللہ کی طرف سچائی کے ساتھ دعوت دیتا ہوں۔ بخدا یہ دعوت برحق ہے۔ اے ابوبکر! میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ تم ایک اللہ کو مانو جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کے سلسلے میں اہلِ اطاعت کی امداد کرو۔" آنحضرت نے حضرت ابوبکر کو قرآن بھی پڑھ کر سنایا۔ حضرت ابوبکر نے تردد کیا نہ انکار بلکہ فوراً اسلام قبول کرلیا....." ملاحظہ ہو ابن اسحاق، ص۱۴۲ ؛ زرقانی (م ۱۱۲۲ھ/۱۸۰۵ء) شرح المواہب اللدنیہ والمنح المحمدیہ للقسطلانی، طبع بولاق ۱۸۷۴ء بحوالہ سید مودودی، دوم ص۱۴۵ ۔ جبکہ مولانا شبلی، اول ص۲۰۵ ؛ ادریس کاندھلوی، اول ص۱۵۶-۱۵۸ نے ابن ہشام اول ص۲۶۷-۲۶۸ کی متابعت میں حضرت ابوبکر کے قبول اسلام کا ذکر تو کیا ہے اور عام دعوتِ نبوی کا بھی لیکن اس کی تفصیل نہیں دی خاص کر دعوتِ نبوی کا یہ واقعہ نہیں بیان کیا ہے۔

۱۰ حضرت ابوبکر صدیق کے قبولِ اسلام کے ضمن میں ابن اسحاق کا بیان کردہ دعوتِ نبوی کا آخری جملہ توجہ طلب ہے جو دوسرے الفاظ میں اور دوسری مادی اور اخلاقی امداد کے علاوہ تبلیغ و اشاعتِ اسلام میں ان کے کارگذار و کارگر تعاون کو طلب کرنے کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے اور ان کا فریضہ ایمانی بھی قرار دیتا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق نے اسی فریضہ کے احساس اور ایمانی جذبہ کے تحت اپنے دوستوں کو دعوت دی اور بقول ابن اسحاق ان کی تبلیغ سے متاثر ہوکر حضرات زبیر بن عوام (اسدی)، عثمان بن عفان (اموی) طلحہ بن عبیداللہ (عدوی) سعد بن ابی وقاص (زہری) اور عبدالرحمٰن بن عوف (زہری) نے اسلام قبول کرلیا۔ یہ سب حضرات حضرت ابوبکر کی معیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے۔ آنحضرت نے

انھیں قرآن سنایا اور اسلام کی حقیقت سے روشناس کیا نیز اللہ کی طرف سے نوازشات کے وعدوں کی بشارت دی چنانچہ وہ ایمان لے آئے اور اسلام کی حقانیت کا اقرار کرنے والے بن گئے۔" ابن اسحاق ص۱۴۳؛ ابن ہشام اول ص۲۶۸ نے دعوتِ نبوی کے بارے میں کچھ نہیں کیا ہے۔

نیز ملاحظہ ہو مولانا شبلی اول ص۲۰۶؛ مولانا ادریس کاندھلوی، اول ص۱۵۸؛ مولانا مودودی، دوم ص۱۵۴۔ موخرالذکر نے دعوت وتبلیغ صدیقی اور اس کے نتیجہ میں اچھی خاصی تعداد کے مسلمان ہونے کا ذکر کیا ہے تاہم مذکورہ بالا پانچ صحابہ کرام کا نام نہیں لیا ہے۔

۱۱ھ مولانا مودودی، دوم ص۱۵۲ فرماتے ہیں: "ان (حضرت ابوبکر) کی قوم کے لوگ ان کے علم، ان کی تجارت اور ان کے عمدہ برتاؤ کی وجہ سے بکثرت ان سے ملتے اور ان کے پاس آکر بیٹھتے تھے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاکر انھوں نے جن جن لوگوں پر اعتماد کیا ان تک دعوت پہونچائی اور ایک اچھی خاصی تعداد ان کی تبلیغ سے متاثر ہوکر مسلمان ہوگئی....."

۱۲ھ مولانا مودودی اسی سلسلۂ بالا میں متصلاً فرماتے ہیں کہ...."پھر جو جو مسلمان ہوتا گیا وہ آگے اپنے حلقۂ احباب میں نیک روحوں کو تلاش کرکرکے اندر ہی اندر اسلام پھیلاتا گیا۔"

سید مودودی ہی وہ واحد سیرت نگار ہیں جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تین بناتِ مطہرات حضرت زینب، حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "تاریخ وسیرت کی کتابوں میں انھیں ابتدائی چار مسلمانوں کا نام لیا جاتا ہے لیکن یہ فرض نہیں کیا جاسکتا کہ حضور کی جو صاحبزادیاں اس وقت ہوشمندی کی عمر کو پہونچ چکی تھیں وہ اپنی والدۂ ماجدہ کے ساتھ ایمان نہ لائی ہوں گی...." اس پر یہ اضافہ کیا جاسکتا ہے کہ بناتِ مطہرات حضرت خدیجہ کی دعوت پر اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت وشخصیت کے سبب اسلام لائی تھیں۔ ملاحظہ ہو سید مودودی دوم ص۱۴۲-۱۴۳ حاشیہ ۱ از مولف۔

۱۳ھ ابن سعد، چہارم ص۹۴-۹۵ نے حضرت خالد بن سعید اموی کے قبول اسلام کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کی تلخیص کے لیے ملاحظہ ہو: مولانا ادریس کاندھلوی، اول ص۱۶۲-۱۶۳ جو لکھتے ہیں کہ حضرت خالد بن سعید اموی نے ایک خواب دیکھا کہ وہ اُن کا باپ ان کو ایک آگ سے بھری خندق میں ڈھکیل رہا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اچانک پہونچ کر بچا لیتے ہیں۔ انھوں نے یہ خواب حضرت ابوبکر صدیق سے بیان کیا اور حضرت صدیق نے ان کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا مشورہ دیا۔ تعمیل میں جب وہ خدمت نبوی میں حاضر ہوئے تو آپ نے مختصراً یہ دعوت دی: "میں تم کو اللہ وحدہ لاشریک کی طرف بلاتا ہوں اور کہتا ہوں کہ محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور اس کی بھی دعوت=

دیتا ہوں کہ پتھروں کی عبادت جو تم کرتے رہے ہو چھوڑ دو کہ وہ نہ نقصان پہونچاتے ہیں اور نہ نفع اور نہ یہ جانتے ہیں کہ کون ان کی عبادت کرتا ہے اور کون نہیں کرتا۔"

۱۴ ابن حجر عسقلانی، الاصابہ اول ص۳۲۷ ، مولانا ادریس کاندھلوی، اول ص۱۶۵-۸

۱۵ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، سوم ص۲۹۳ میں دعوت و تبلیغ صدیقی کا ذکر نہیں ہے۔ مولانا ادریس کاندھلوی اول ص۱۶۸

۱۶ ابن سعد، چہارم ص۲۴۳ وما بعد نے دار ارقم میں قیام نبوی سے قبل ان کے اسلام کا ذکر کیا ہے۔

ابن اثیر، اسد الغابہ، سوم ص۴۱۳-۱۴ ؛ ابن حجر، اصابہ، قاہرہ ۱۹۳۹ء اول ص۲۳۹-۴۰ پر اس کا ذکر نہیں ہے۔ مولانا ادریس کاندھلوی، اول ص۱۶۰-۶۱۔ ابن عبد البر، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، برحاشیہ اصابہ مذکورہ بالا، اول ص۲۱۱-۱۲ پر ان کے اسلام لانے کا واقعہ منقول نہیں ہے۔

۱۷ ابن اثیر، اسد الغابہ، سوم ص۴۱۴-۱۵ ؛ ابن عبد البر، الاستیعاب برحاشیہ اصابہ قاہرہ ۱۹۳۹ء، سوم ص۱۶۳-۶۵ ادریس کاندھلوی، اول ص۱۶۱-۶۲، بحوالہ عیون الاثر۔

۱۸ ابن سعد، طبقات، سوم ص۲۲۷ ان دونوں حضرات نے پینتیس ۳۵ مسلمانوں کے بعد اسلام قبول کیا تھا، نیز سوم ص۲۴۷-۴۸ ادریس کاندھلوی، اول ص۱۶۸-۶۹۔

۱۹ مکہ مکرمہ کے سابقین اولین میں ممتاز ترین حضرات و خواتین جو اس زمرہ میں آتی ہیں ان میں حضرات بلال بن رباح حبشی، حضرت یاسر، حضرت سمیہ، حضرت عمار، حضرت زنیرہ، حضرت ام عبیس، حضرت نہدیہ وغیرہ۔

یہ عجیب بات ہے کہ زیادہ تر کمزور مسلمانوں (مستضعفین) کے قبول اسلام کے حالات و اسباب کا ذکر نہیں ملتا۔

۲۰ ابن اسحاق ص۱۶۴ ؛ بخاری، کتاب : قصہ اسلام ابی ذر۔ ابن سعد، چہارم ص۲۱۹-۲۵، ادریس کاندھلوی، اول ص۱۷۰-۱ ؛ سید مودودی، دوم ص۵۳۷-۴۰۔

سید جلال الدین عمری، "رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوتی مکاتیب" تحقیقات اسلامی، علی گڑھ جلد ۷ شمارہ ۲ (اپریل جون ۱۹۸۸ء) ص۵ کا یہ بیان کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ میں تھے اسلام کی دعوت عام نہ ہوسکی۔ قریش کے ظلم وستم نے اس کی راہ میں زبردست رکاوٹیں کھڑی کر رکھی تھیں" صحیح نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ اسی مکی دور میں اسلام مکہ مکرمہ سے نکل کر جنوب میں اشعر، دوس وغیرہ، مغرب میں بحرین تک اور شمال میں مدینہ اور اس سے پرے تک معروف ہو چکا تھا۔

۲۱ ابن سعد، چہارم ص۱۰۵ حضرت موسیٰ اشعری، ص۱۱۶-۱۷ حضرت معیقب بن ابی فاطمہ دوسی ص۲۳۷-۳۸ حضرت طفیل بن ازدی کے لیے۔ ان کے بارے میں وضاحت ملتی ہے کہ وہ جب مکہ آئے تو قریشی اکابر نے ان کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی برائی کرکے آپ سے ملاقات کرنے سے منع کیا۔ حضرت طفیل اس قدر متاثر ہوئے تھے

کہ مسجد حرام جاتے تو کانوں میں روئی ڈال لیتے کہ آپ کا کلام سن نہ لیں۔ بعد میں خیال آیا کہ وہ کوئی بچہ نہیں، صاحبِ عقل و شعور آدمی اور ذہین و فطین شاعر ہیں، سننا تو چاہیے کہ آپ کہتے کیا ہیں؟ چنانچہ آپ کا پیچھا کرتے ہوئے آپ کے گھر میں داخل ہوئے اور آپ کی دعوت کے بارے میں پوچھا۔ آپ نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا اور قرآن کریم کی آیات تلاوت کیں۔ پھر وہ مسلم تھے۔ آپ نے ان کو اسلام کی تبلیغ کرنے کے لیے مامور کیا اور قبیلہ دوس کے کافی لوگوں کو مسلمان کیا۔

۲۲ قدیم مآخذ میں اس موضوع پر کوئی واضح روایت نہیں ملتی۔ ابن سعد نے کئی جلدوں میں اس مرکز اسلامی کا ذکر کیا ہے لیکن تاریخ کوئی نہیں دی۔

مولانا ادریس کاندھلوی اول ص۱۷۱ کا خیال ہے کہ "مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی جماعت ہوگئی تو حضرت ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مکان جمع ہونے کے لیے تجویز ہوا" مولانا مودودی، دوم ص۱۵۴-۵ کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کے آنے کے ڈھائی سال سے کچھ زیادہ مدت گذری تھی کہ کچھ مکی مسلمان چھپ کر مکہ کی ایک گھاٹی میں نماز پڑھ رہے تھے کہ مشرکین کے ایک گروہ نے ان کو دیکھ لیا اور سخت سست کہا جس پر بات بڑھ گئی اور حضرت سعد بن ابی وقاص نے ایک شخص (عبداللہ بن خطل ادرمی) کو ہڈی مار کر زخمی کر دیا۔" اس کے بعد حضور نے بلا تاخیر حضرت ارقم بن ابی ارقم کے مکان کو جو صفا کے قریب واقع تھا مسلمانوں کے اجتماع اور دعوت و تبلیغ کا مرکز بنا دیا۔"

مولانا مودودی نے مشرکین کے زخمی ہونے والے شخص کو "بنی تیم کا عبداللہ بن خطل قرار دیا ہے۔ عبداللہ بن خطل کا تعلق قریش الظواہر کے خاندان بنو ادرم / بنو تیم بن غالب سے تھا نہ کہ صرف بنو تیم سے۔ کیونکہ صرف بنو تیم سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ وہ حضرت ابوبکر صدیق کا خاندان تھا۔ ملاحظہ ہو مصعب زبیری، کتاب نسب قریش، مرتبہ لیفی بروفنبال، دار المعارف قاہرہ ۱۹۵۳ء، ص۳-۲۴۲۔

جدید مورخین اور سیرت نگاروں میں مستشرق ولیم مونٹگمری واٹ (W. Montgomery Watt) نے دار ارقم کے مرکز اسلامی یا مقام نبوی بنائے جانے کی تاریخ / زمانہ ۶۱۳ء قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو اردو معارف اسلامیہ دانش گاہ پنجاب لاہور (مقالہ الارقم)۔ اس اعتبار سے وہ علانیہ دعوت کے زمانے کا واقعہ بنتا ہے نہ کہ خفیہ دور تبلیغ کا۔ خاکسار نے بھی یہی غلطی کی ہے ملاحظہ ہو 'عہد نبوی میں تنظیم ریاست و حکومت' القاضی پبلشرز نئی دہلی ۱۹۸۸ء ص۸۰ جو واٹ کی تاثر پذیری کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

۲۳ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مکان "الدار ارقطار" نامی مقام / محلہ میں واقع تھا جو مسجد حرام / کعبہ کے میں مسعیٰ (سعی کرنے کی جگہ جو صفا اور مروہ کے دو پہاڑوں کے درمیان واقع تھا) کی سمت میں تھا۔ آپ کے بدقماش پڑوسیوں میں ابولہب ہاشمی، حکم اموی، عقبہ بن ابی معیط اموی، عدی بن حمرا ثقفی

اور ابن الاصدار ہذلی کے نام آتے ہیں۔ قرب وجوار میں ابن ابی حسین، عباس بن عبد المطلب ہاشمی، ابن ازہر زہری اور اخنس بن شریق کے مکانات و احاطے تھے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو خاکسار کا مضمون "معیشت نبوی ۔ مکی عہد میں"۔ تحقیقات اسلامی، علی گڑھ جلد ۹ شمارہ ۳ (جولائی ستمبر ۱۹۹۰ء) ص ۹-۲۸۔ حوالہ کے لیے ابن ہشام، اول ص ۳۶۹ وغیرہ۔ بدقماش پڑوسیوں کے لیے ملاحظہ ہو ابن سعد، اول ص ۲۰۱ وغیرہ۔

۲۴ دار ارقم کے جائے وقوع کے بارے میں ہمارے عام سیرت نگاروں نے مختلف بیانات دئے ہیں جن سے غلط فہمی اور الجھن پیدا ہوتی ہے۔ ابن اسحاق ص ۱۹۱ اور ابن ہشام اول ص ۳۶۶ کا بیان ہے کہ وہ صفا پہاڑی کے قریب (فی بیت عند الصفا) تھا۔ مولانا شبلی، اول ص ۲۲۵ کا بیان ہے کہ "حضرت ارقم کے مکان میں جو کوہ صفا کی تلی میں واقع تھا۔۔" مولانا ادریس کاندھلوی، اول ص ۱۷۱، کوہ صفا پر آپ کا مکان تھا۔" مولانا مودودی، دوم ص ۱۵۵ کے خیال میں "کوہ صفا کے قریب تھا۔" مشہور مستشرق مونٹگمری واٹ کا خیال ہے کہ وہ کوہ صفا پر واقع تھا اردو معارف اسلامیہ دانش گاہ پنجاب لاہور (مقالہ الارقم)

ابن سعد، سوم ص ۳-۲۴۲ کے مطابق وہ کوہ صفا پر واقع تھا۔ وہ عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور (دور ۱۳۶-۱۵۸ھ/۷۵۴-۷۷۵ء) کے عہد تک موجود تھا۔ اس سلسلہ میں ابن سعد کی ایک اور روایت اس کے جائے وقوع کی صراحت کرتی ہے۔ خلیفہ منصور جب حج کے لیے مکہ مکرمہ پہونچے تو وہ صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے لگے۔ راوی کا بیان ہے کہ اس وقت ہم لوگ دار (ارقم) کی چھت (ظہر) پر ایک خیمہ میں موجود تھے۔ خلیفہ ہمارے نیچے سے گذرتے اور وہ اتنے قریب ہوتے کہ اگر میں ان کی ٹوپی (قلنسوہ) اتارنا چاہتا تو آسانی سے اتار لیتا۔ وہ وادی کی تلی (بطن) سے صفا کی طرف چڑھتے ہوئے ہماری طرف دیکھتے رہتے تھے۔" نیز ابن سعد، سوم ص ۲۶۸ پر اس کو اصل الصفا میں واقع ہونا بتایا ہے۔

۲۵ مذکورہ بالا تمام مورخین و سیرت نگاروں کے ہاں دار ارقم میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مستقل قیام/سکونت کا واضح یا مضمر ذکر ملتا ہے جو بظاہر صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ رازداری اور خفا کا مقصد اس صورت میں فوت ہو جاتا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کوئی غیر معروف داعی اور مصلح نہ تھے بلکہ مکہ مکرمہ کے معروف و معتبر شخص تھے اور مکہ کے متعدد افراد و خاندان سے آپ کے سماجی اور تجارتی تعلقات تھے اس لیے اپنے سکونتی مکان سے آپ مستقل غیر حاضری یا دوسرے مکان میں مستقل سکونت مسائل پیدا کر سکتی تھی۔ یہ بحث طلب اور تحقیق طلب باب سیرت ہے جس پر ابھی مفصل و مدلل کام نہیں ہوا۔ ملاحظہ ہو خاکسار کا آئندہ مضمون "دار ارقم ۔ اولین مرکز اسلامی"۔

۲۶ مولانا ادریس کاندھلوی، اول ص ۱۷۱ کا خیال ہے کہ حضرت عمر کے اسلام لانے تک رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام وہیں جمع ہوتے تھے حضرت عمر کے اسلام لے آنے کے بعد جہاں چاہتے جمع ہوتے"
(بحوالہ اصابہ اول ص۲۸۵)

مولانا مودودی دوم ص۱۵۵ فرماتے ہیں کہ تین سال کی خفیہ دعوت کا دور ختم ہونے اور علانیہ دعوت عام شروع ہوجانے کے بعد بھی یہ مسلمانوں کا مرکز رہا۔ اسی میں حضور تشریف فرما رہتے تھے.... اور شعب ابی طالب کی محصوری تک.... اسی کو دعوتِ اسلام میں مرکزی حیثیت حاصل رہی۔"

بہرحال ابن سعد، سوم ص۲۴۳-۲۴۲ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شروع اسلام میں دار ارقم میں ہوا کرتے تھے (کان یکون)

۲۷ھ ابن سعد، سوم ص۵۱، ص۵۵، ص۸۴، ص۸۹، ص۱۱۶

۲۸ھ ابن سعد، سوم ص۲۲۷ — ۲۹ھ ابن سعد، سوم ص۲۲۲، ص۳۸۸، نیز ص۱۲۳

۳۰ھ ابن سعد، سوم ص۲۱۵ — ۳۱ھ ابن سعد، سوم ص۱۵۰-۱

۳۲ھ ابن اسحاق ص۹-۱۴۸؛ ابن ہشام اول ص۲۷۴

نیز ملاحظہ ہو شبلی نعمانی، اول ص۲۱۰، ادریس کاندھلوی، اول ص۱۴۲ نے ابن اسحاق کی پیروی کی ہے؛ سید مودودی دوم ص۴۹۵ نے قریب ترین رشتہ داروں کو دعوتِ عام دینے میں صرف ایک آیت سورہ شعراء ۲۱۴ کا ذکر کیا ہے۔

۳۳ھ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: بلاذری، انساب الاشراف، اول ص۱۱۹ کے مطابق آپ نے بنو عبد مناف کو دوسری مجلس میں مخاطب کرکے فرمایا تھا: "اللہ کی قسم جس کے سوا اور کوئی معبود و الٰہ نہیں، میں تمہاری طرف خاص کر اور سارے انسانوں کے لیے عام طور سے اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں...."

۳۴ھ سید مودودی، پاک ص۵-۴۹۳ نے اس سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حرم میں نماز پڑھنے اور ابوجہل مخزومی کے رکاوٹ ڈالنے کا ذکر کیا ہے اور آخر میں قریش کے دوسرے لوگوں کے ہجوم کرنے کو بھی سورہ جن ۱۹ کے حوالہ سے بیان کیا ہے اور تفسیر و حدیث کی متعدد روایات و کتب کا حوالہ دیا ہے۔

۳۵ھ ابن ہشام اول ص۹-۳۶۸

۳۶ھ ابن ہشام اول ص۹-۳۶۸ نے ابن اسحاق کی ایک دوسری روایت حضرت عمر بن خطاب کے قبولِ اسلام کے بارے میں یہ بیان کی ہے کہ ایک شام جب وہ طوافِ کعبہ کرنے پہونچے تو آپ کو نماز پڑھتے ہوئے پایا۔ وہ اپنی یہ خواہش کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت سنیں چھپا نہیں پائے اور غلاف کعبہ میں =

چھپ کر سننے لگے۔ حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ جب میں نے آپ سے قرآن سنا تو میرے دل میں رقت پیدا ہوئی اور میرے دل میں اسلام بھی داخل ہو گیا اور میں خوب رویا۔ مسجد حرام/کعبہ سے آپ کی واپسی پر آپ کا پیچھا کیا اور راستہ میں اسلام قبول کیا۔ ابن اسحاق کا تبصرہ بھی نقل کیا ہے کہ اللہ جانے کہ ان میں سے کون سی روایت صحیح ہے۔ اس روایت میں تلاوت قرآن کی تاثیر کا ذکر بالکل صحیح ہے جس کی تائید دوسری روایات سے ہوتی ہے۔

سید مودودی، دوم ص۵-۴۶۷ نے حضرت عمرؓ کے اولین تاثر کے سلسلہ میں ابن اسحاق کی مذکورہ بالا روایت ذرا مختلف انداز میں مسند احمد اور طبرانی سے نقل کی ہے جس میں ان کے سورہ حاقہ کی تلاوت سننے کی تصریح ہے۔ حاشیہ میں مسند ابن سنجر کا مؤلف نے اضافہ کیا ہے۔ اس میں اسلام کے ان کے دل میں گہرا اترنے کا واضح ذکر ہے اگرچہ قبول اسلام کا ذکر نہیں ہے۔

اسلام عمرؓ کے بارے میں مشہور عام روایت جو زیادہ تر سیرت نگاروں نے نقل اور قبول کی ہے اس میں بھی حضرت عمرؓ کے قرآن سے متاثر ہونے اور اسی کے تحت اسلام قبول کرنے کا صریح ذکر ہے۔ ملاحظہ ہو: ابن ہشام اول ص۸-۳۶۶؛

۳۷؎ ابن اسحاق ص۲۰۰-۱۹۹، ص۱۷-۲۱۶ نے سورہ اسراء/بنی اسرائیل ۱۱۰ کی تفسیر میں واقعہ مندرجہ ذیل نہیں لکھا ہے لیکن روایت میں لکھا ہے۔ ابن ہشام، اول ص۸-۳۳۷ کا بیان ہے کہ مذکورہ بالا تینوں اکابر قریش نے الگ الگ یہ فیصلہ کیا کہ رات میں جب آپ اپنے گھر میں نماز میں تلاوتِ قرآن کرتے ہیں تو اس کو سنا جائے۔ وہ چھپ کر اپنی اپنی جگہ بیٹھ رہے اور رات بھر آپ کی تلاوت سنی۔ طلوع فجر کے وقت جب وہ واپسی کے لیے چلے تو راستہ میں مڈبھیڑ ہو گئی اور ایک نے دوسرے کو لعنت ملامت کرتے اور جدا ہو جاتے۔ ان کے دل اسلام کی طرف متوجہ ہو چکے تھے لیکن حسد و طغیان اور خاندانی زعم و غرور میں قبولیت کے لیے زبانیں نہ کھلیں۔

۳۸؎ ابن ہشام اول ص۳۳۶ نے قرآن مجید کی سورہ بنی اسرائیل ۱۱۰ کے حوالہ سے آپ کی تلاوت نماز کا ذکر کیا ہے اور حضرت عبداللہ بن عباس کی یہ تفسیر بیان کی ہے کہ نہ اتنی زور سے نماز میں تلاوت کریں کہ لوگ چھٹ جائیں اور اتنی پست آواز میں پڑھیں کہ جو سننا چاہتے ہیں وہ سن نہ سکیں۔ ممکن ہے کہ چوری چھپے سننے والوں میں سے کوئی ان آیات کریمہ کو کسی ایسے تک پہونچا دے جو اس سے نفع پائے۔ اس پر یہ اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ شاید سننے والوں میں سے ہی کسی کو فیض پہونچے جیسا کہ حضرت عمرؓ کے سلسلہ میں ہوا تھا۔ نیز ابن ہشام اول ص۸-۳۳۷، تعلیقہ مذکورہ بالا نیز ملاحظہ ہو تفسیر آیتِ بالا کے لیے تفاسیر قرآن کریم خاص کر ابن کثیر، تفسیر القرآن، جلد سوم ص۹-۶۸

۳۹؎ ابن ہشام، اول ص۷-۳۳۶ کا بیان ہے کہ ایک دن اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم جمع ہوئے تو یہ معاملہ زیر بحث آیا کہ قریش نے اس قرآن کریم کو کبھی علانیہ اور جہری تلاوت کے ذریعہ نہیں سنا ہے تو کون انھیں سنائے گا؟

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جب اپنا نام پیش کیا تو صحابہ کرام نے ان کے بارے میں خدشہ ظاہر کیا اور کہا کہ ہم تو ایک صاحب عزت وجاہ اور خاندان والے کو چاہتے ہیں کہ مبادا قریش کے اکابر دستِ ظلم دراز کریں تو وہ ان کی حمایت وحفاظت کر سکے۔ لیکن حضرت ابن مسعودؓ نے اللہ تعالیٰ کی حمایت ونصرت کے بھروسے پر یہ کام کر ڈالا۔

۴۰ھ ابن اسحاق ص۳-۲۵۲ کی اس روایت میں کافی اختلاف ہے مثلاً حضرت ابوبکر کی مسجد کو ان کے گھر کے صحن میں واقع ہونا بتایا گیا ہے۔ ابن ہشام، اول ص۶-۳۹۴۔ قریش کے لوگ اس تلاوت قرآن سے اپنے متعلقین کو فتنہ میں مبتلا ہونا مراد لیتے ہیں۔

۴۱ھ ابن اسحاق ص۹-۱۴۸؛ بلاذری، انساب الاشراف اول ص۸-۱۱۸۔ بلاذری کی اس روایت میں آپ کے دعوتی خطبہ کے بڑے مؤثر الفاظ نقل کیے گئے ہیں۔ اور ابوطالب کی حمایت نبوی کے علاوہ قوم کے کلام لین کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس کے بعد متصلاً دوسری روایت میں حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب اور ابولہب بن عبدالمطلب کی رسالت نبوی کے بارے میں گفتگو نقل کی گئی ہے کہ وہ تصدیق کرتی تھیں اور وہ تکذیب کرتا تھا۔

اصلاً یہ دونوں واقدی کی روایت ہیں اور ان میں روایتی لحاظ سے کلام ہو سکتا ہے لیکن مغزِ کلام اور متن روایت میں اسلامی روایت کے مطابق ہے۔

۴۲ھ ابن اسحاق ص۱۵۰ نے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے اولاد عبدمناف! اے اولاد عبدالمطلب! اے فاطمہ محمدؐ کی بیٹی! اے صفیہ رسول اللہ کی پھوپھی! تم لوگ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بچاؤ کیونکہ میں اللہ کی گرفت سے تم کو بچانے کا کوئی اختیار نہیں رکھتا... یہ کافی مفصل حدیث ہے۔

یہ حدیث و روایت صحیح کتب احادیث میں بھی ملتی ہے۔ ملاحظہ ہو بخاری، صحیح، کتاب التفسیر، سورہ تبت یدا وغیرہ نیز حاشیہ و تعلیقہ ۴۳ھ۔

۴۳ھ بخاری صحیح، کتاب التفسیر، سورۃ الشعراء، سورۂ سبا، سورہ تبت یدا؛ کتاب احادیث الانبیاء باب من انتسب الی آبائہ، صحیح مسلم، باب وانذر عشیرتک الاقربین، کتاب الایمان۔ حیرت ہے کہ ابن اسحاق وابن ہشام نے کوہِ صفا سے خطاب نبوی کا ذکر نہیں کیا۔ ملاحظہ ہو: ابن اسحاق، ص۵-۱۴۸؛ ابن ہشام اول ص۵-۲۷۴؛ البتہ بلاذری اول ص۵-۲۷۴؛ البتہ بلاذری اول ص۲۱-۱۱۹ نے کوہ صفا سے خطاب و دعوتِ نبوی کی تین روایات اپنے تین مختلف شیوخ سے نقل کی ہیں مگر ان تینوں کے آخری راوی ایک ہی حضرت ابن عباس ہیں۔ ان تینوں میں خطاب نبوی کے الفاظ و دعوت کے علاوہ بعض دوسرے اختلافات بھی ہیں جو ان کو تین مختلف مواقع کا خطاب بھی بنا سکتے ہیں اگرچہ عام طور سے ان کو ایک ہی واقعہ کی تین مختلف تعبیرات قرار دیا جاتا ہے۔

سورۂ شعراء ۳ میں ارشاد ربانی ہے: لعلک باخع نفسک الا یکونوا مومنین (شاید تو=

گھونٹ مارے اپنی جان اس پر کہ وہ یقین نہیں کرتے) ابن کثیر، تفسیر القرآن، سوم ص۳۳۱ نے اس کو آپ کے لیے تسلی ربانی قرار دیا ہے۔ یہ صحیح ہے مگر اس میں آپ کی جاں سوز تبلیغ کا اعلان بھی ہے۔

۴۴ ابن اسحاق ص۱۵۱ اور ص۲۲۹ ، ابن ہشام دوم ص۳۲-۳۱، ابن کثیر۔ سید مودودی، دوم ص۶-۵۰۲

۴۵ ابن کثیر، تفسیر القرآن، چہارم ص۹-۵۲۸؛ شاہ عبدالقادر دہلوی، موضح القرآن ف ا ص۱۰۰۳ ؛ اس پر مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو سید مودودی، دوم ص۴-۴۹۳ ۔

ابن ہشام اول ص۳۳۳ نے النادی کی یہ تعریف کی ہے: وہ مجلس جس میں قوم جمع ہوتی اور اپنے امور پر بحث کرتی ہے اور حوالہ میں قرآن مجید سورہ عنکبوت ۲۹ وتاتون فی نادیکم المنکر (اور کرتے ہو اپنی مجلس میں برا کام) اور عبید بن الابرص کے شعر کے علاوہ بعض دوسری آیات قرآنی مریم ۷۳ اور اقرا ۱۷ سے استشہاد کیا ہے۔

۴۶ ابن اسحاق اور ابن ہشام نے ان قریشی مجالس کا ذکر متعدد مواقع پر کیا ہے۔ عہد جاہلیت میں ان کا ایک ذکر جناب عبداللہ بن عبدالمطلب ہاشمی کی قربانی کے ضمن میں آیا ہے۔ جبکہ جناب عبدالمطلب بن ہاشم کی مجلس کا مفصل ذکر ملتا ہے جس میں ان کے فرزند ان کی مسند کے حاشیہ پر بیٹھا کرتے تھے مگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے بچپن کے زمانے میں اس مجلس خاص میں مسند جد امجد پر بیٹھنے کی اجازت حاصل تھی۔ ملاحظہ:

ابن ہشام قاہرہ ۱۹۵۵ء، اول ص۳-۱۵۲ اور ص۱۶۸ وغیرہ؛ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ اول ص۹-۲۳۸

حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمی کے قبول اسلام کے ضمن میں ابن ہشام نے ایک اہم مجلس قریش کا ذکر کیا ہے۔ اس تاریخ ساز دن ابوجہل مخزومی نے کوہ صفا کے پاس رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر آپ سے سخت بدتمیزی کی اور پھر جا کر خانہ کعبہ کے پاس قریش کی ایک مجلس (نادی) میں جا بیٹھا۔ حضرت حمزہ نے شکار سے واپسی پر معمول کے مطابق طواف کیا اور قریش کی ہر مجلس کے قریب ٹھہرے، اہل مجلس کو سلام کیا اور ان سے کلام کیا۔ جب واپس ہوئے تو عبداللہ بن جدعان کی ایک باندی نے ابوجہل مخزومی کی بدتمیزی اور بدکلامی کا ذکر ان سے کر دیا۔ حضرت حمزہ غصہ سے بھر گئے اور واپس جا کر بھری مجلس میں نہ صرف اپنی کمان سے ابوجہل کی مرمت کر دی بلکہ اپنے اسلام کا اعلان بھی کر دیا۔ ملاحظہ ہو ابن ہشام اول (قاہرہ ۱۹۵۵ء) ص۲-۲۹۱ ؛ ابن اسحاق ص۸-۱۷۹ ۔

۴۷ ابن اسحاق ص___ ؛ ابن ہشام اول ص۴-۳۱۳ ۔

۴۸ ابن اسحاق ص۱۹-۲۰۸ ؛ ابن ہشام اول ص۹-۳۱۵ ۔

۴۹ ابن اسحاق ص۱۲-۲۱۱ ؛ ابن ہشام، اول ص۲۰-۳۱۹ ۔

۵۰ھ ابن اسحاق، صـ۲۱۳ـ۲ ؛ ابن ہشام اول صـ۳۵ـ۳۲ - ابن اسحاق کی یہ روایت بہت مختصر ہے جبکہ ابن ہشام کے ہاں کافی تفصیل ہے۔

۵۱ھ ابن ہشام اول صـ۳ـ۲۸۲ ؛ ابن اسحاق صـ۱ـ۲۰۸

۵۲ھ ابن ہشام، اول صـ۳۸۶ کا بیان ہے کہ یہ بحث مباحثہ دوران طوافِ نبوی ہوا تھا۔ لیکن اس کا صحیح مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملاقات تو دوران طواف ہوئی مگر گفتگو مجلس میں ہوئی۔

۵۳ھ ابن ہشام، اول صـ۳۸۸ نیز تفاسیر قرآن۔

۵۴ھ ابن ہشام اول صـ۹ـ۴۱۸ - بعض روایات کے مطابق مسلمان ہونے والے نصاریٰ حبشہ کے نہیں نجران کے تھے۔ ابن اسحاق اور ان کے مدیر نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ لیکن انھوں نے اول الذکر کو ترجیح دی ہے۔

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی کی نئی پیشکش

عہد نبوی کا نظام حکومت

پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی

سیرتِ نبوی اور اس کے مختلف پہلوؤں پر اب تک چھوٹی بڑی بے شمار کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور یہ سلسلہ تا قیامت جاری رہے گا۔ لیکن اس کتاب میں اس لحاظ سے جدت اور ندرت پائی جاتی ہے کہ وہ ایسے موضوعات پر مشتمل ہے جن سے کتب سیرت میں بہت کم تعرض کیا گیا ہے۔ ابتدا میں عہد رسالت میں ریاست کے تدریجی ارتقاء پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے پھر اس کے دور مبارک میں شہری نظم ونسق اور فوجی، مالی اور مذہبی نظاموں سے مفصل بحث کی ہے۔

اسلامی تاریخ اور سیرت نبوی پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی کا خاص موضوع ہے۔ ان کا نام اعلیٰ تحقیقی معیار کی ضمانت ہے۔

کتاب پر مولانا سید جلال الدین عمری سکریٹری ادارہ اور نائب امیر جماعت اسلامی ہند کا مختصر اور مفید مقدمہ بھی ہے۔

آفسٹ کی خوبصورت طباعت، عمدہ کاغذ، صفحات ۱۳۶ قیمت ۳۰/- زیادہ منگوانے پر خصوصی رعایت

مکتبہ تحقیق وتصنیف اسلامی - پان والی کوٹھی - دودھ پور علی گڑھ

بحث ونظر

فلسفۂ نظمِ قرآن

متوازن نقطۂ نظر

مولانا سلطان احمد اصلاحی

قرآنی علوم ومعارف کے مسائل میں ایک اہم مسئلہ قرآن کے نظم اور اس کی ترتیب کے سلسلے میں اب تک کی علماء کی جماعت کو تین طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک طبقہ وہ ہے جو کتاب اللہ میں سرے سے کسی قسم کے نظم وترتیب کا انکار کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ قرآن تیئس سال کے طویل عرصے میں حالات کے لحاظ سے تھوڑا تھوڑا کر کے وقفہ وقفہ سے اترتا رہا۔ بعد میں انہی متفرق آیات کو ایک ترتیب سے جمع کر دیا گیا۔ پس اس طرح کے کسی کلام میں نظم وارتباط کی تلاش ایک سعی بے سود ہے[1]۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو کتاب اللہ میں سخت گیر نظم کا تو قائل نہیں جیسا کہ آگے آنے والا تیسرا طبقہ ہے، تاہم وہ فی الجملہ کتاب الٰہی میں نظم وترتیب کا قائل ہے، اور قرآن کی تفسیر میں جا بجا وہ اپنی بساط کی حد تک اس نظم کو اجاگر کرنے اور اسے نبھانے کی کوشش کرتا ہے[2]۔ تیسرے طبقے میں مفسرین کی وہ قلیل جماعت ہے جو پورے التزام اور سختی سے نہ صرف یہ کہ ایک سورہ کی تمام آیات کو ایک دوسرے سے مربوط مانتا ہے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ایک سورہ کا دوسری سورہ سے نظم قائم کرتا ہے اور اس طرح اول تا آخر کتاب اللہ کو ایک مکمل مربوط ومنظم کتاب کی صورت میں پیش کرتا ہے جس سے اعلیٰ اور برتر نظم وارتباط کسی انسانی اور غیر انسانی تصنیف میں نہیں کیا جا سکتا[3]۔ اسی تیسرے طبقے سے ہمارے دور آخر کے اہم مفسر قرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کا تعلق ہے جنھوں نے بعض پہلوؤں سے اس کے سلسلے میں وہ گہرائی اور نیا پن سامنے لانے کی کوشش کی ہے جس کی نظیر اس کے قائل دوسرے علماء ومفسرین کے یہاں بھی نہیں ملتی۔ یہاں تک کہ تفسیر میں ان کی شناخت ہی فلسفۂ نظم قرآن کے داعی اور مبلغ کی حیثیت سے قائم ہو گئی ہے۔ جس کا بجا طور پر ان کو حق پہنچتا ہے۔ کتاب اللہ پر

اس پہلو سے جس یکسوئی اور انہماک سے فکر و تدبر کا انھوں نے حق ادا کیا ہے، علمائے امت میں کم ہی لوگوں کے حصے میں یہ سعادت اس وافر مقدار میں شائد ہی آسکے۔ قرآنیات پر ان کی تمام تر کتابوں کا یہی مرکزی نکتہ ہے اور یہی محور ہے جس کے گرد ان کی فکری مساعی کا پورا کارواں گردش کرتا ہے[۱۵]۔ ذیل کی سطور میں کتاب اللہ میں نظم و ترتیب کی نسبت سے ان تینوں آراء کے مدنظر نقطۂ اعتدال و توازن کی تلاش مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس نازک موضوع پر وہ بات کہنے کی توفیق عطا فرمائیں جو ان کو پسند ہو اور جو ان کی نازل کردہ کتاب عظیم و حکیم کے شایانِ شان ہو۔ وما توفیقی الا باللہ۔

نظم قرآن اصلاً توقیفی ہے

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات جو سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ نظم قرآن اصلاً توقیفی ہے۔ کتاب اللہ میں بوجوہ نظم و ترتیب کو ناگزیر ماننے کے باوجود، جس کی تفصیل آگے آتی ہے، اصلاً یہ ترتیب توقیفی اور تعبدی ہے۔ جس طرح عبادات و معاملات میں اعداد و مقادیر کا معاملہ اصلاً توقیفی اور تعبدی ہے، کتاب اللہ میں نظم و ترتیب کے معاملے کو اس سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ نماز کے اوقات، اس کی رکعتوں کی تعداد، روزہ کا وقت اور اس کے لیے ایک مخصوص مہینے کی تعیین، زکوٰۃ کا نصاب اور اس کے وجوب کے لیے حولان حول کی شرط، حج کے مخصوص ایام اور مراسم کا مخصوص انداز، چوری میں کہنیوں سے ہاتھ کا کاٹا جانا، غیر محصن زانی کے لیے سو کوڑے کی سزا، قصاص میں دیت کی مخصوص مقدار وغیرہ وغیرہ بے شمار معاملات و مسائل میں اعداد و مقادیر کا معاملہ اصلاً توقیفی اور تعبدی ہے، جس کی حکمتوں اور مصلحتوں پر علماء نے ہر دور میں بحث کی ہے اور آج تک اس کا سلسلہ جاری ہے[۱۶]۔ لیکن یہ محض سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش ہے اور جیسا کہ کہا گیا ہے اس طرح کی بحثوں کا اصل تخاطب کمزور ایمان کے لوگوں سے ہے، ورنہ سچے مسلمان کا مسلک بے چون وچرا اللہ کے ہر حکم اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر فرمان پر ایمان اور اس پر مخلصانہ عمل ہے[۱۷]۔ نظم قرآن کے سلسلے میں بھی صحیح بات یہی ہے کہ اپنی بساط کے مطابق اسے جس قدر بھی سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی جائے، فی الحقیقت اس کا معاملہ اس کتاب کے نازل کرنے والے کی طرف راجع ہے۔ دین کے دیگر اعداد و مقادیر کے ساتھ اپنی کتاب کے نظم و ترتیب کی

حکمت و مصلحت کو بھی دراصل وہی جان سکتے ہیں۔ اللہ کی آخری کتاب کبھی ختم نہ ہونے والے علوم و معارف کا لازوال خزانہ ہے اور اس میں واجب فکر و تدبر کا ایک حصہ اس کے نظم و ترتیب کا بھی ہو سکتا ہے، جیسا کہ علماء کی ایک جماعت کے یہاں اس کا احترام اور التزام ہے، لیکن آخری بات یہی ہے کہ یہ بندے کی ادنیٰ اور حقیر سمجھ ہے، اصل حقیقت کا علم اس کے نازل کرنے والے کو ہی ہو سکتا ہے۔ سمجھ میں آئے نہ آئے کتاب اللہ کی ترتیب برحق ہے، انتشار اور خلل سے بالکل پاک علوم و معارف کا گنجینہ ہونے کے ساتھ یہ نظم و ترتیب کا شاہکار ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی بندے کو اس سے کس قدر حصہ ملتا ہے اور عبادات و معاملات کے دیگر اعداد و مقادیر کی حکمتوں اور مصلحتوں کی دریافت کے ساتھ وہ کتاب اللہ کے نظم و ترتیب کو بھی کسی قدر ڈھونڈھنے اور نکالنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

نظمِ قرآن ترتیب آیات و سور کا لازمی تقاضا

جیسا کہ اشارہ گزرا، کتاب الٰہی میں آیتوں اور سورتوں کی ایک خاص ترتیب اس کے اندر کسی نہ کسی نوع کے لازمی نظم و ارتباط کا تقاضا کرتی ہے۔ اس سلسلے میں جہاں تک ایک سورہ کی آیتوں کی ترتیب کا سوال ہے تو اس کے توقیفی اور من جانب اللہ ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، اس لیے سراپا علم و حکمت ذات خداوندی کی اس ترتیب میں تو نظم و ارتباط کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں، یہ الگ ہے کہ وہ ہماری سمجھ میں کس قدر آتا ہے یا آتا بھی ہے یا نہیں۔ سورتوں کی ترتیب کے سلسلے میں بھی صحیح بات یہی ہے کہ آیتوں کی ترتیب کی طرح ان کی ترتیب بھی توقیفی اور من جانب اللہ ہے۔ امت میں جن بزرگوں نے سورتوں کی ترتیب کو حضرات صحابہ کرامؓ کے اجتہاد پر محمول مانا ہے ان کی رائے صحیح نہیں ہے[۵۸] جس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ حضرات صحابہ کرامؓ جن کی بہت بڑی اکثریت کو قرآن شریف از اول تا آخر حفظ تھا، اگر صرف کتاب اللہ کی آیتوں کی ترتیب ہی توقیفی ہوتی، سورتوں کی ترتیب توقیفی نہ ہوتی، تو کتاب اللہ کی تلاوت، نوافل میں اس کی قرأت اور اس کے ورد و مذاکرے کی مجلسوں میں بار بار اس میں اختلاف اور مصحف سے مختلف ترتیب کا جابجا تذکرہ ہوتا جبکہ حدیث و سیرت اور تاریخ کے پورے ذخیرے میں اس کی ایک بھی نظیر نہیں ملتی۔ اس کے برعکس

ہفتے میں مختلف و متعدد حضرات صحابہؓ کے ختم قرآن کا جو کورس (حزب) تھا اس میں مصحف کی موجودہ ترتیب کے مطابق ہر روز سورتوں کی ایک خاصی تعداد کی تلاوت کی صراحت ہے۔ یہ اپنے آپ میں اس کا ثبوت ہے کہ نہ صرف ایک سورہ کی آیات بلکہ از اول تا آخر سورتوں کی ترتیب بھی اس طرح من جانب اللہ متعین کردہ صدر اول میں معلوم و متعارف تھی۔ جس کے سلسلے میں کسی اختلاف اور دوسرے خیال کا دور دور تک کہیں سراغ نہیں مزید براں معلوم ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وصال سے قبل ہر رمضان میں کتاب اللہ کا حضرت جبرئیلؑ کے روبرو دورہ کرتے تھے، جس سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا اس سے متصل رمضان میں یہ دورہ معمول سے ہٹ کر دو بار ہوا۔ ایک بار جبرئیل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پورا قرآن سنایا، دوسری بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے اس کا دورہ کیا۔ آیتوں کے برعکس اگر کتاب اللہ کی سورتوں کی ترتیب توقیفی نہ ہوتی تو کسی نہ کسی مرحلے میں اس دوہرے دورے میں ترتیب کا اختلاف ضرور سامنے آتا۔ جبکہ حدیث و سیرت کے پورے ذخیرے میں دور دور تک اس کا کوئی سراغ نہیں۔ مزید یہ کہ جب دوسرے اور تیسرے نمبر پر حدیث اور فقہ کی کتابوں میں ایک کتاب کے بعد دوسری کتاب اور ایک باب کے بعد دوسرے باب کی ترتیب کی مناسبت اور ان کے باہمی ربط و ارتباط کے التزام کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے اور بے شک و شبہ اسے پسندیدگی اور تحسین کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، تو صرف کتاب اللہ کے ساتھ ہی یہ امتیازی برتاؤ کیوں کہ اس کے اندر کسی قسم کے نظم و ترتیب کے نہ ہونے کو ہی اس کا مایہ الافتخار سمجھا جائے اور اسے اس کی عظمت اور بلندی کی دلیل باور کرایا جائے۔ عام انسانی کتاب میں بھی لمبے عرصے میں لکھے گئے اس کے متفرق مضامین کو کتابی شکل میں لاتے وقت اپنے بس بھر اسے حسن ترتیب کا نمونہ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، تو خدائے عظیم و برتر کی کتاب رفیع تو بدرجہ اولیٰ اس کی مستحق ہے کہ اسے نظم و ترتیب سے عاری نہ قرار دیا جائے اور عام انسانی تصنیف کی نسبت سے جو چیز اس کا نقص قرار پائے کتاب اللہ کے سلسلے میں اسے اس کا کمال باور کرایا جائے۔

نظمِ قرآن کا ایک نیا پہلو

اس اصولی بات کو تسلیم کر لینے کے بعد کہ کتاب اللہ میں کسی نہ کسی نوع کا نظم و ترتیب

ضرور موجود ہے، آگے اس کی تعیین اور اس میں غور و تدبر کی جولان گاہ بہت وسیع ہے۔ اس سلسلے میں جہاں تک ایک سورہ کی آیتوں میں نظم و ترتیب کا سوال ہے اس کی یاد دہانی اور اس کی طرف توجہ کا اہتمام تو کسی نہ کسی درجے میں مفسرین کی اکثریت کے یہاں ہے۔ ایک سورہ کے دوسرے سورہ سے ربط و تعلق کے سلسلے میں بھی مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں اور بہت سی باتیں کہی گئی ہیں[۱۰]۔ اسی طرح کی ایک بات کتاب اللہ کے اس ادنیٰ طالب علم کی سمجھ میں آتی ہے۔ پورا قرآن سورۂ فاتحہ میں بندے کی دعا کا جواب ہے، یہ بات بہت لوگوں نے کہی ہے، یہ خود ایک طرح سے پورے قرآن کے نظم کا بیان ہے۔ اس کے علاوہ معلوم ہے کہ کتاب اللہ میں شروع سے آخر تک مکی اور مدنی سورتوں کا خاص امتزاج ہے، جس کے سلسلے میں بھی دوسری باتیں کہی گئی ہیں[۱۱]۔ ایک اور بات بھی سمجھ میں آتی ہے۔ کتاب اللہ اصلاً کتاب دعوت ہے اور اس سے تذکیر اور اعتبار اس کا اصل مقصود ہے۔ اس کے لحاظ سے مکی اور مدنی سورتوں کی خاص ترتیب کا دوسرا پیغام بھی ہو سکتا ہے۔ اس امت کے لیے وسیع دائرے میں دین پر عمل کے مدنی زندگی کے حالات اس کی سورتوں کے مصداق اسی صورت میں پیدا ہو سکتے ہیں جبکہ اس سے پہلے مکی سورتوں کے مصداق مکی زندگی کے تقاضوں سے کامیاب عہدہ برآری کا وہ ثبوت پیش کر دے۔ نیز یہ کہ وسیع تر دائرہ زندگی سے متعلق مدنی سورتوں کی تعلیمات پر عمل کے لیے ضروری ہے کہ مکی سورتوں میں ایمانیات و عقائد میں مضبوطی اور پختگی کی جو تعلیم ہے، اسے اپنے اندر اتارا اور جذب کیا جائے۔ مکی سورہ فاتحہ کے بعد بقرہ، آل عمران، نساء اور مائدہ کی مدنی سورتوں کا جو سلسلہ ہے، اس کے بعد دو مکی انعام و اعراف کے بعد انفال و توبہ مدنی، بعد ازاں طویل مکی سلسلوں کے درمیان حج و نور[۱۲]، آگے اسی طرح احزاب، محمد، فتح اور حجرات، آگے اسی طرح مکی کے بعد حدید کے ساتھ پورا اٹھائیسواں پارہ مدنی، باقی آخری دونوں پاروں میں تمام مکی سورتوں میں بینہ، زلزال، کوثر، نصر اور معوذتین مدنی۔ یہ تمام مدنی سورتیں دراصل بقرہ تا مائدہ کے مدنی سلسلے کا تکملہ و تتمہ ہیں، جس طرح کہ انعام و اعراف کے بعد کا آخر قرآن تک کا پورا مکی سلسلہ ان دونوں سورتوں کا حصہ اور ضمیمہ ہے۔ ان مکی اور مدنی سلسلوں کو عام تقسیم کے لحاظ سے یکجا نہ رکھ کر انھیں مکی اور مدنی کے امتزاج سے آگے بڑھانے کی ایک حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے جو اوپر بیان ہوئی کہ قیامت تک کے لیے مکی اور مدنی حالات سے دوچار الگ الگ

خطوں اور الگ الگ علاقوں اور ملکوں سے وابستہ امت کے لیے ان میں یہ پیغام رہے کہ وہ پہلے مکی زندگی کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہوں جب انھیں مدنی زندگی کے حالات سے واسطہ ہوگا، نیز یہ کہ مدنی سورتوں کو سنبھالنے اور ان سے کامیاب عہدہ برآ ہونے کے لیے مکی سورتوں کے عقائد و ایمانیات کو اپنے اندر پختہ سے پختہ تر کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ایک طالبعلمانہ غرض ہے ورنہ ہر صاحب توفیق اپنی حیثیت سے اس کی حکمتوں اور مصلحتوں کو تلاش کر سکتا اور اسے دنیا کے سامنے پیش کرنے کا حق رکھتا ہے۔

غلو سے پرہیز

لیکن اس کے ساتھ ہی نظم قرآن اور اس کی ترتیب و مناسبت کے مسئلے میں غلو سے پرہیز کرنے کی ضرورت ہے۔ قرآن میں نظم ضروری ہے اور اللہ کی کتاب اگر حسن ترتیب کا شاہکار نہ ہو تو اور کسے اس کا حق پہنچتا ہے۔ لیکن، جیسا کہ گزرا، اصلاً یہ نظم و ترتیب توقیفی اور تعبدی ہو کر اس کی تلاش اور جستجو کو ایک دائرے کے اندر محدود رکھنا ہی مناسب ہے۔ اس پس منظر میں ہند میں تفسیر کے ایک خاص مکتب فکر کی طرف سے جو نظم قرآن کو دین و ایمان کا اصل مسئلہ اور اس کی طرف عدم توجہ کو امت کی تمام خرابیوں کی جڑ اور اس کے تمام تر افتراق و انتشار کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے[۱۳] یہ مبالغہ آمیز ہے۔ قرآن نے جو اس امت کو خیر امت[۱۴] کہا ہے تو اس میں یہ بات شامل ہے کہ قیامت تک کے لیے اس امت کی 'یہ خیریت' اسی طرح باقی رہے گی یہی بات ہے جو حدیث میں اس طرح کہی گئی ہے کہ قیامت تک یہ امت دین کے صحیح راستے پر قائم رہے گی[۱۵] نیز یہ کہ یہ امت کبھی بھی گمراہی پر اکٹھا نہ ہوگی[۱۶] جو اصول فقہ میں حجیت اجماع کی بنیاد ہے[۱۷]۔ مزید براں ایک حدیث میں اس امت کو 'شہداء اللہ فی الارض' کے خطاب سے نوازا گیا ہے جس کی تفصیل میں یہ مضمون ہے کہ اس کی گواہی سے ایک شخص کے لیے جنت یا جہنم کا فیصلہ ہو سکتا ہے[۱۸] جس امت کا قرآن و سنت میں یہ مقام ہو اسے محض نظم قرآن میں غفلت سے یہود و نصاریٰ کی روش پر عمل پیرا اور ان کے گناہوں کی مجرم نہیں گردانا جا سکتا، جیسا کہ نظم قرآن کے موید مخصوص حلقے کی طرف سے اسے اسی جرم کا مرتکب قرار دیا گیا ہے[۱۹]۔ قرآن و سنت کی تعبیر اور دین کے کسی حصے کی ترجمانی کی اصل خوبی یہ ہے کہ اس

کے ہر مرحلہ میں اعتدال و توازن سے رشتہ استوار رہے اور تعبیر کے کسی جز میں مبالغہ آرائی اور غلو اور تشدد کو در آنے کا موقع نہ ملے۔

نظمِ قرآن تفسیر کی امکانی غلطی سے حفاظت کی ضمانت نہیں

نظم قرآن کے موید اس مخصوص حلقے کی طرف سے یہ بات بہت ابھار کر کہی گئی ہے کہ نظم قرآن فہم قرآن کی کلید ہے اور اس کی بدولت تفسیر قرآن کی امکانی غلطی سے حفاظت کی ضمانت مل جاتی ہے۔ سورہ کے عمود اور نظم اور آیت کے سیاق و سباق سے ہر آیت کی ایک متعین تفسیر نکھر کر سامنے آجاتی ہے اور آدمی اِدھر اُدھر کی تاویلات کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ نظم قرآن کی فہم قرآن کی نسبت سے کیا اہمیت اور اس کا کیا درجہ ہے اس پر گفتگو ہم آگے کریں گے، اس کی بدولت تفسیر قرآن کی امکانی غلطی سے حفاظت کی ضمانت کی بات بھی جس زور شور سے کہی گئی ہے حقائق اس کی تائید کرنے سے قاصر ہیں۔ اسی کی اساس پر اس کے سب سے بڑے وکیل مولانا فراہیؒ نے سورہ فیل کی بالکل طبع زاد تفسیر پیش کی[۲۰] جس کی تردید کے لیے کتاب اللہ میں 'ارسلنا علیٰ' کے مواقع استعمالات پر ایک نظر ڈال لینا ہی کافی ہے۔ ایک 'ارسلنا الیٰ' ہے جس کا استعمال قرآن میں رسولوں اور فرشتوں وغیرہ کے بھیجنے کے عام معنی میں ہے[۲۱] دوسرا 'ارسلنا علیٰ' ہے جس کا استعمال بلا استثناء کتاب اللہ میں مختلف چیزوں کو سرکش اقوام و جماعات پر عذاب الٰہی کے طور پر بھیجنے کے لیے ہے۔ فرعون کا حکمراں خانوادہ جب خشک سالیوں اور غلے اور پھلوں کی خدائی تنبیہات سے حضرت موسیٰؑ کی مخالفت سے باز نہیں آیا تو ان کی بددعا سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے اوپر دوسرے عذابوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دریائے نیل کی طغیانی اس درجہ بڑھی کہ کھیت باغ اور گھروں کا بڑے پیمانے پر نقصان ہوا۔ باقی جو کسر رہی اسے ٹڈی دلوں نے پورا کیا جو ان کے پھلوں اور سبزی کی کھیتیوں کو صاف کر گئیں۔ مزید جوئیں رہیں جو ان کے بدن اور کپڑوں میں پڑ کر ان کے لیے عذاب بن گئیں۔ آگے مینڈک کی بلا تھی جو ان کے گھروں میں بھر گئی اور ان کے کھانوں میں ڈبڈبانے لگی۔ آخری آفت یہ کہ پانی خون میں تبدیل ہو جاتا جس سے زندگی اجیرن ہو گئی[۲۲] اس آفت اور عذاب کے لیے کتاب اللہ نے 'ارسلنا علیٰ' کے الفاظ استعمال کیے۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝ (اعراف: ۱۳۳)

تو ہم نے ان کے اوپر دریائی طوفان، ٹڈیاں، جوئیں، مینڈکوں اور خون کو مسلط کر دیا، یہ بہت ہی کھلی اور ابھری ہوئی نشانیاں تھیں، اس کے باوجود وہ اپنے غرور کی روش پر اڑے رہے، واقعی یہ بڑے مجرم لوگ تھے۔

آگے قرآن نے صاف لفظوں میں اس کے لیے عذاب 'رجز' کا لفظ استعمال کیا[۲۳] اور فرعون کو غرق دریا کیے جانے کے اپنے آخری عذاب کو اسی سلسلے کی اگلی کڑی قرار دیا:

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بَالِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ۝ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ۝ (اعراف: ۱۳۶)

تو جب ان پر یہ عذاب آ پڑا تو وہ عرض گزار ہوئے کہ اے موسیٰ تم اپنے رب سے اس چیز کے لیے دعا کرو جس کا اس نے تم سے وعدہ کر رکھا ہے۔ اگر تم یہ عذاب ہم سے ہٹا دو تو ہم لازمی تم پر ایمان لائیں اور تمہارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دیں۔ تو جب ہم نے ان سے اس عذاب کو مختصر مدت کے لیے ہٹا دیا جس تک پہنچنے میں انھیں بہت دیر نہیں ہو سکتی تھی تو پھر وہ بہت جلد اپنی پرانی بدعہدی پر اُتر آئے۔ تو اب ہم نے ان سے بدلہ لیا اور انھیں سمندر میں غرق کر دیا۔ اس لیے کہ انھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا اور ان سے غفلت کی روش پر پڑے رہنے پر مطمئن رہے۔

اس سے زیادہ واضح معاملہ سورہ قمر میں 'علیٰ' کے ساتھ 'ارسال' کے استعمال کا ہے۔ جہاں بہ ترتیب قوم عاد، ثمود اور قوم لوط کے لیے زبردست آواز کے ساتھ طوفانی ہوا، چنگھاڑ اور پتھروں کی بوچھاڑ کرنے والی ہوا کے عذاب کے بیان میں

اسی ترکیب کا استعمال کیا گیا:

اِنَّآ اَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ رِيۡحًا صَرۡصَرًا فِىۡ يَوۡمِ نَحۡسٍ مُّسۡتَمِرٍّ (۱۹) [۲۴]

ہم نے ان کے اوپر تیز و تند ہوا کو مسلط کر دیا ایک نحوست کے دن میں جس کا سلسلہ آگے تک دراز رہا۔

اِنَّآ اَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ صَيۡحَةً وَّاحِدَةً فَكَانُوۡا كَهَشِيۡمِ الۡمُحۡتَظِرِ (۳۱)

ہم نے ان کے اوپر ایک ہی چنگھاڑ مسلط کی جس کے بعد وہ روندی ہوئی باڑھ کے مانند چورا ہو کر رہ گئے۔

اِنَّآ اَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ حَاصِبًا اِلَّاۤ اٰلَ لُوۡطٍ ؕ نَجَّيۡنٰهُمۡ بِسَحَرٍ (۳۴)

ہم نے ان کے اوپر کنکریلی ہوا مسلط کر دی، صرف لوط کے خاندان اور اس کے پیروکار اس سے الگ رہے جنھیں رات اندھیرے ہی ہم نے بچا کر نکال دیا۔

نظم قرآن کی اسی ضمانت کے باوجود رجم محصن کی امت کی اجماعی رائے کا انکار کیا گیا اور زانی کی سزا کے سلسلے میں بالکل بے اصل شگوفہ چھوڑا گیا اور استاد کی غلطی کو شاگرد نے پورے شرح صدر کے ساتھ دوہرایا[۲۶]۔ اور مقطع کے طور پر اس کی وہ وکالت سامنے آئی جسے انصاف کی زبان میں 'ظلمات بعضها فوق بعض' کے سوا دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا[۲۷]۔ اور نظم کی اسی کلید کو ہاتھ میں رکھنے کے باوجود مکتب فراہی کے سب سے بڑے ترجمان نے سورہ فتح کی آیت کریمہ:

لِّتُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَتُعَزِّرُوۡهُ وَتُوَقِّرُوۡهُ ؕ وَتُسَبِّحُوۡهُ بُكۡرَةً وَّاَصِيۡلًا (۹)

تاکہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، رسول کی مدد کرو، اللہ کی عزت کرو اور صبح و شام اس کی پاکی کے بیان کا اہتمام رکھو۔

کے ٹکڑے 'توقروہ' میں وقار کے استعمال کو ذات باری تعالیٰ کے لیے ناموزوں اور کتاب اللہ کے مواقع استعمال سے ہٹا ہوا قرار دیا[۲۸] جبکہ سورۂ نوح میں اللہ تعالیٰ کے نام کی صراحت سے ان کے لیے اس لفظ کو استعمال کیا گیا:

مَا لَـكُمۡ لَا تَرۡجُوۡنَ لِلّٰهِ

تمہیں کیا ہو گیا ہے جو تم اللہ کی عزت

وَقَارًا ۝ وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا ۝ نہیں کرتے جبکہ وہی ہے جس نے تمہیں کئی
(۱۳ — ۱۴) کئی مرحلوں سے گزار کر تمہاری تخلیق کو مکمل کیا۔

عام طور پر اس مکتب فکر کی طرف سے بے وقعت و بے مایہ قرار دی جانے والی تفسیر کی متداول کتابوں میں ایسی فاحش غلطی کی نظیر ابھی تک ان سطور کے لکھنے والے کی نظروں سے نہیں گزری۔

صلب العلم نہیں ملح العلم

اس تفصیل کی روشنی میں فلسفۂ نظم قرآن کو اس کی مناسب اہمیت کے اعتراف کے ساتھ صلب العلم کے بجائے ملح العلم کے خانے میں رکھے بغیر چارہ نہیں۔ معلوم ہے کہ علمائے اصول نے اپنی اہمیت اور اقدمیت کے اعتبار سے اسلامی علوم کی درجہ بندی کی ہے۔ اس کے ایک حصے کو انھوں نے اصلی اور حقیقی علم قرار دیا ہے تو دوسرے کو نکتہ آفرینی اور لطائف کے ذیل میں رکھا ہے۔ پہلے کو جسے صلب العلم کہا گیا ہے اس میں عام ضرورت کا شریعت کا علم ہے جس کی لازمی عملی ضرورت ہو، دوسرا 'ملح العلم' ہے جس کی عملی افادیت کو وہ اہمیت حاصل نہ ہو جیسے کہ نماز روزے وغیرہ کے تعبدی پہلوؤں کی حکمت کی تلاش۔ یہاں تک کہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی اگر ایک صحیح سند فراہم ہو جائے تو اس کے بعد مضمون کے اضافہ کے بغیر محض اسناد کے تنوع اور اس کی کثرت کو بھی بجائے 'صلب العلم' کے 'ملح العلم' کے دائرے میں رکھا گیا ہے[۲۹] جس کی روشنی میں آج کے دینیات و اسلامیات کے بہت سارے کاموں کو جو تحصیل حاصل کے درجے میں ہوں انھیں 'صلب العلم' کے بجائے 'ملح العلم' کا ہی نام دینا مناسب ہوگا۔ اسی طرح ان کے مطلوب اور محمود کاموں کے حوالے برائے حوالے کے کافی بڑے حصے کو بھی اسی 'ملح العلم' میں شامل کرنے کے لیے مجبور ہونا پڑے گا۔ اس روشنی میں دیکھا جائے تو انسانی تصنیفات کے انداز پر ازاول تا آخر سخت گیر نظم قرآن کے فلسفہ کو بھی بجائے صلب العلم کے ملح العلم کے زمرے میں لانے سے مفر نہیں۔

کتاب اللہ کی احکامی آیات ہوں یا آیات اعتبار و حکمت ہر ایک میں بنائے حکم اور بنائے استدلال آیات کا کوئی جھرمٹ یا ان کا کوئی مجموعہ نہیں بلکہ انفرادی آیات ہیں۔

عالمی اہمیت کے لٹریچر کی عظمت کا راز بھی ان کے سخت گیر نظم اور ترتیب کے بجائے ان کے منفرد ٹکڑوں اور جداگانہ حصوں سے وابستہ ہے۔ مثنوی مولانا روم کی عظمت اس کے نظم و ترتیب سے زیادہ اس کے انفرادی اشعار اور الگ الگ حکایتوں سے وابستہ ہے۔ نہ یہ کہ ایک شعر کے بعد دوسرا شعر کیوں ہے یا یہ کہ ایک حکایت کے بعد دوسری آیت کیوں آئی ہے۔ یہی بات حافظ اور غالب کی شاعری، مجدد الف ثانی کے مکتوبات اور حضرت شرف الدین یحییٰ منیری کے مکتوبات صدی کے سلسلے میں صادق آتی ہے۔ تورات اور انجیل کی بھی آج جو اہمیت ہے یا ہو سکتی ہے وہ بھی ان کی انفرادی آیات اور انفرادی تعلیمات اور متعین مجموعۂ واقعات سے ہے۔ مقدس تورات کی بڑائی اس سے نہیں کہ خروج کے بعد احبار اور گنتی کے بعد استثنا کیوں آیا۔ یا یہ کہ انجیل میں متی کی انجیل کے بعد مرقس کی انجیل اور لوقا کی انجیل کے بعد یوحنا کی انجیل کیوں آئی ہے۔ زمخشری بھی جو قرآن کے اعجاز کو اس کے نظم میں مضمر مانتے ہیں[۳۰] تو اس کا مطلب بھی ان کے نزدیک ایک آیت کریمہ کے اندرونی در و بست سے ہی ہے جس کے کسی ایک نگینے کے ہٹ جانے سے پورا تاج خلل کا شکار نظر آنے لگتا ہے جس سے شبہ ہوتا ہے کہ سلف میں جن دوسرے لوگوں نے نظم قرآن کے عنوان سے کتابیں لکھیں[۳۱] ان کا منشا فراہی مکتب فکر کے نظم قرآن سے ہٹ کر منفرد آیات کا یہی در و بست تو نہیں جس کی عظمت بے غبار اور جس کے روبرو انسان اپنی عجز و بے مائگی کے اعتراف کے لیے اپنے کو مجبور پاتا ہے۔

قرآن کا ذو وجوہ ہونا 'لاینقضی عجائبہ' کا لازمی تقاضا

کہنے کو یہ بات بہت اچھی لگتی ہے کہ سخت گیر نظم قرآن ہی فہم قرآن کی کلید ہے۔ کلام عرب کی روشنی میں الفاظ کی تحقیق، سورہ کے مرکزی مضمون 'عمود' اور آیت کے سیاق و سباق سے ہر آیت کریمہ اور اس کے ہر حصے کا ایک متعین مفہوم نکھر کر سامنے آگیا اور کتاب اللہ کے سلسلے میں مختلف و متنوع تاویلات کا دروازہ بند ہو گیا جس سے ذہنی انتشار اور قلبی تشتت کی کیفیت سے نکل کر طالب قرآن شرح صدر کی دولت سے مالا مال ہو گیا۔ لیکن گہرائی سے دیکھا جائے تو کتاب اللہ کی مدح سے

زیادہ اس میں اس کی قدح کا پہلو ہے۔ ہر مسلمان کا یہ ایمان ہے اور قرآن کے ہر مفسر کے یہاں اس کا اعتراف ہے کہ کتاب اللہ علوم و معارف کا بحر ناپیدا کنار ہے جس کی تہ تک پہنچنا تو درکنار اس کی سطح کو چھونے کا دعویٰ کرنا بھی اپنی محدود عقل و فہم اور محدود صلاحیتوں کے ساتھ انسان کے لیے اپنے اوپر سب سے بڑا ظلم ہے۔ جس کے سلسلے میں عام طور پر عظمت قرآن کے سلسلے میں حضرت علیؓ کی طویل مشہور روایت کے مذکورہ ٹکڑے 'لا ینقضی عجائبہ' کا حوالہ دیا جاتا ہے[۳۱] یہ روایت مجہول اور اس کے ایک راوی پر کلام ہے[۳۲] محض اس کی شہرت کی بنا پر ہم نے سب سے پہلے اس کا حوالہ دیا لیکن اس کے مضمون میں کوئی کلام نہیں اور دوسرے صحیح طریقوں سے یہ بالکل ثابت ہے۔ قرآن کی عظمت کے سلسلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری صحیح حدیث جس میں لہجوں کے اختلاف کی گنجائش کے ساتھ قرآن کے ایک ظاہری اور ایک باطنی مفہوم کا تذکرہ ہے۔ انزل القرآن علی سبعة احرف لکل آیة منها ظهر و بطن۔ (قرآن سات حرفوں پر اترا ہے، اس کی ہر آیت کا ایک ظاہری اور اس کا ایک باطنی مفہوم ہے) اس سے آگے کا ٹکڑا ہے:

ولکل حد مطلع — ہر پڑاؤ اپنے سامنے نئی منزل کا نشان رکھتا ہے۔

اس کا یہی مطلب ہے کہ کتاب اللہ کے ایک ایک ٹکڑے اور اس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف کے سلسلے میں غور کرنے والا جسے اپنے فکر و تدبر کی آخری منزل سمجھتا ہے حقیقت کے اعتبار سے وہ اس کی پہلی منزل ہوتی ہے۔ جس پڑاؤ کو وہ اپنی آخری ٹھکان سمجھ کر اس پر ٹھہرنا چاہتا ہے، جھانک کر دیکھتا ہے تو اس کے عین سامنے اسے دوسرا پڑاؤ نظر آتا ہے یہاں تک کہ یہ سفر انتہا کے بغیر اسی طرح جاری رہتا ہے۔ لیکن اس سے بڑھ کر یہ مضمون کتاب اللہ کی آیت ذیل سے ثابت ہوتا ہے۔

قل لو کان البحر مدادا	کہئے کہ اگر میرے رب کی باتوں کے
لکلمت ربی لنفد البحر	بیان کے لیے سمندر بھی روشنائی میں
قبل أن تنفد کلمت ربی	تبدیل ہو جائے تو یہ روشنائی بھی ختم
ولو جئنا بمثله مددا	ہو جائے لیکن میرے رب کی باتیں ختم
(کہف: ۱۰۹)[۳۳]	ہونے کا نام نہ لیں، چاہے اس کے برابر
	ہی ہم دوسری روشنائی کا انتظام کیوں نہ کریں۔

۷۸

اب اگر سخت گیر نظام قرآن کی بدولت ہر لفظ کے ایک ہی معنی اور ہر آیت کی ایک ہی تاویل کی گنجائش رہے تو اس کا صاف مطلب ہوا کہ اس مطلوب تفسیر کے بعد کتاب اللہ کے عجائبات ختم ہو گئے، قرآن کا مسافر اپنے پڑاؤ کی آخری ٹکان پر آگیا اور رب کی باتیں ایک خاص تفسیر کے دائرے میں محدود ہو کر رہ گئیں۔ یہ کتاب اللہ کی مدح نہیں اس کی قدح ہے۔ انسانی تصنیفات میں بھی جنھیں امہات کتب کہا جاتا ہے ان کی اصل خوبی یہی ہے کہ ان کا مواد ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ طالب علمی کے دور سے لے کر عمر کے آخری ایام تک آدمی ان سے چمٹا رہتا ہے، لیکن ان سے ہر نئی مراجعت اپنے ساتھ نئے نکات اور نئے مضامین برآمد کرتی ہے۔ حق یہ ہے کہ معانی کی اس وسعت میں کتاب اللہ کا جواب نہیں۔ چودہ سو سال کے عرصے میں قرآنی علوم و معارف کے دفتر کے دفتر بھر گئے اور لائبریریوں کی لائبریریاں تیار ہو گئیں لیکن ہنوز تدبر قرآن کا قافلہ اپنی ابتدائی منزل کو بھی پا لینے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ استادان فن کی کسی غزل کے ایک شعر کی کسی تشریح کو اس کی آخری اور حتمی تشریح قرار نہیں دیا جا سکتا تو کتاب اللہ کا مقام تو اس سے بہت بلند ہے کہ انسانی ذہن اس کی وسعتوں کو قید کرنے کا دعویٰ کر سکے۔

متنوع تفسیر قرآن عظمتِ قرآن کی مظہر

حقیقت یہ ہے کہ متنوع تفسیر قرآن عظمت قرآن کی مظہر ہے، یہ اس کا عیب نہیں بلکہ اس کے حقیقی حسن کی آئینہ دار ہے۔ قرآن حقیقۃً تذکیر اور یاد دہانی کی کتاب ہے اور اس کی اصل حیثیت انسانی مسائل کے لیے شاہ کلید کی ہے۔ اس لحاظ سے اس پر اصل فکر و تدبر یہ ہے کہ تفسیر قرآن کی بنیادی شرطوں کی تکمیل سے اس سے مسائل کا استنباط کیا جائے۔ مسائل سے مطلب معروف فقہی مسائل ہی نہیں بلکہ اس میں روحانیات و فقہیات کے جملہ مسائل شامل ہیں اور کتاب اللہ کا ہر حصہ ان کے لیے کسی نہ کسی درجہ میں ماخذ اور منبع کا مقام رکھتا ہے۔ دین کی سمجھ کے اعتبار سے امت میں بلا اختلاف سیدنا فاروق اعظمؓ کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ مختلف مواقع پر کتاب اللہ سے استنباط مسائل کی نسبت سے انھوں نے اپنی باریک بینی اور گہری نظر سے حضرات صحابہؓ کی پوری جماعت کو دم بخود کر دیا۔[۳۵] صرفی و نحوی مسائل میں تعمق کو البتہ انھوں نے پسند نہ کی

کی نگاہ سے نہیں دیکھا اور کتاب اللہ سے مطلوبہ استفادے کے لیے اس کو بڑی حد تک غیر ضروری قرار دیا[٣٥] اس کے نمونوں کو دیکھنا ہو تو تفسیر سے قطع نظر اپنے اپنے میدانوں میں آدمی فقہاء اور صوفیاء کی کتاب اللہ سے اخذ و استنباط کے نظائر کو دیکھے جنھیں عام طور پر کتاب اللہ پر غور و فکر کی نسبت سے ان کے قرار واقعی مرتبہ و مقام سے محروم رکھا جاتا ہے[٣٦] اخذ و استنباط کی یہ گہرائی اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جبکہ کتاب اللہ کے ایک ایک لفظ اور اس کے ایک ایک ٹکڑے سے آدمی نئے مضامین اور نئے مسائل کو تلاش کرنے کی اہلیت سے بھرپور ہو۔ اس پس منظر میں دین کے فہم اور اس کے مطلوبہ تفقہ کے سلسلے میں بالکل صحیح کہا گیا ہے:

لا یفقه العبد کل	بندے کو دین کی قرار واقعی فہم اور سمجھ
الفقه حتی یری للقرآن	حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ قرآن
وجوها[٣٨]	کے ایک حصے کی کئی کئی زاویوں سے
	تشریح و تفسیر نہ کر سکے۔

اس کی روشنی میں عام تفسیروں سے ہٹ کر 'خلق الانسان ۝ علمه البیان ۝ (رحمن: ۳، ۴) میں بیان سے مراد شریعت' 'والصاحب بالجنب' (نساء: ۳۶) میں علاوہ دیگر کے بیوی کی شمولیت[٣٩]، خلق الانسان ضعیفا (نساء: ۲۸) کا مطلب یہ کہ انسان کے لیے اپنی جنسی خواہش پر قابو پانا دشوار ہے[٤٠]۔ اسی طرح ولا تواعدوھن سرا (بقرہ: ۲۵۰) میں 'سر' سے مراد مجامعت کی قوت یعنی کہ مرد طلاق / وفات کی عدت گزار رہی عورت سے اس کے دوران اپنی بڑھی ہوئی جنسی قوت کے حوالہ سے اسے آمادۂ نکاح کرنے کی کوشش کرے، حضرت امام شافعیؒ اسی تفسیر کے قائل ہیں، اس کی تائید میں امراؤ القیس کا یہ شعر بھی پیش کیا گیا ہے جس میں 'سر' کے معنی قوت مباشرت کے ہیں۔[٤١]

الا زعمت بسباسة الیوم انني   کبرت وان لا یحسن السر امثالي

یا مثلاً آیت جزیہ میں 'وھم صاغرون' (توبہ: ۲۹) کی تفسیر میں حضرت امام شافعیؒ کا یہ نیا خیال کہ اہل ذمہ اسلامی ریاست کے ملکی قوانین برضا و رغبت قبول کر لیں اور ان کے سلسلے میں ان کے یہاں کسی مزاحمت کی کیفیت نہ رہے۔ الصغار ان یجری علیھم حکم الاسلام[٤٢] یا ایسے ہی فراہی مکتب فکر میں غیر معمولی شہرت یافتہ

'استعینوا بالصبر والصلوٰۃ' (بقرہ: ۱۵۳) میں صبر کی عام تفسیر سے ہٹ کر[۵۴] اس کی تفسیر روزہ سے[۵۵]۔ نمونے کی یہ مختلف اور متنوع تفسیریں عظمت قرآن کے لیے قادح نہیں، بلکہ اس سے کتاب اللہ کی وسعت اور اس کے معانی کے پہنائی کا ہی ثبوت فراہم ہوتا ہے جو اس کی بڑائی اور برتری کی دلیل ہے، عام روایت سے ہٹی متنوع تفسیر قرآن کی یہ پیش پا افتادہ مثالیں ہیں جنھیں مرتجلاً ہم نے پیش کیا ورنہ تفسیر سے ہٹ کر فقہ اور تصوف کی دنیا اس کے سلسلے میں بہت مالدار ہے گو کہ سکڑی معلومات کی حامل اور محدود مطالعہ کی خوگر امت کی اکثریت کو اس کا پتہ نہ ہو اور علم و معرفت کے ان انمول خزانوں سے اس کا دامن خالی ہو۔

فہم قرآن کا ایک حجاب بے لچک تقلید

آخری بات سے پہلی بات یہ کہ فقہ کی طرح قرآن کی تفسیر کا اصل مزہ بھی بے لچک تقلید سے آزادی میں مضمر ہے۔ بے لچک تقلید چاہے وہ تفسیر کے کسی بھی مکتب فکر کی ہو حقیقت کے اعتبار سے وہ فہم قرآن کا حجاب ہے۔ حجۃ الاسلام غزالیؒ نے اپنی شاہکار 'احیاء العلوم' میں اگرچہ اس نکتے کی طرف اشارہ تفسیر ماثور اور کلامی مسائل میں کسی خاص توجیہ پر اصرار کے حوالہ سے کیا ہے[۵۶] لیکن سچ یہ ہے کہ اس کا دائرہ اس سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ آزاد غور وفکر کی صلاحیتیں، اس کے آداب اور شرطوں کی تکمیل اور اس کے حدود کی رعایت پر قابو کے باوجود تقلید جامد پر اصرار اس دین میں سب سے بڑا گناہ ہے۔ دراصل یہ علم کی دنیا ہی کا سب سے بڑا حجاب ہے۔ بلکہ اس سے آگے کی بات یہ کہ اس امت کا سیاسی زوال بھی اس کے علمی زوال کے ہم رکاب ہے۔ چوتھی صدی ہجری جو فقہ میں اجتہاد کی آخری صدی مانی جاتی ہے[۵۷] اسی کے بعد سے مسلمانوں کے سیاسی اور قومی زوال کا آغاز ہوتا ہے۔ علوم اسلامی کے دوسرے تمام دائروں میں تو بے لچک تقلید ان کا حجاب اور ان کے راہ کی رکاوٹ ہے ہی، قرآن کے فہم و تدبر کے سلسلے میں بھی اس حجاب اور اس رکاوٹ کو اس سے کم اہمیت دینا صحیح نہ ہوگا۔ معلوم ہے کہ ہمارے ذخیرۂ تفسیر میں مختلف تفسیروں کا مختلف رنگ ہے۔ کہیں تفسیر ماثور کا زور ہے تو کہیں عقلی تفسیر کی چھاپ گہری ہے۔ کہیں صرف ونحو کی طرف زیادہ توجہ ہے تو کہیں

احکام وفقہ کا غلبہ ہے۔ آدمی ان تمام رنگ کی تفسیروں سے استفادہ کرے لیکن حضرت امام غزالیؒ کے بقول تفسیر کی کسی ایک رائے اور آیتِ کریمہ کی کسی ایک توجیہ وتعبیر کو ہی حرف آخر تسلیم کرکے آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔ تقلید کے اس حجاب کے ساتھ فہم قرآن کی کلید اس کے ہاتھ نہیں آسکتی۔ استفادہ سب سے کیا جائے لیکن کتاب اللہ کے حقیقی منشا ومراد کو کسی ایک تفسیر یا تعبیر کا پابند نہ سمجھا جائے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ سخت گیر نظم قرآن کی تقلید کو اس عام اصول سے کیونکر مستثنیٰ کیا جاسکتا ہے۔ فی الجملہ نظم قرآن کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے مواقع کی تفصیل میں نئے گوشوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے اور سخت گیر نظم کا قائل نہ ہوکر بھی کتاب اللہ کے دروازے کو اپنے لیے بند نہیں سمجھنا چاہیے۔ حجۃ الاسلام غزالیؒ کا یہ نکتہ فہم قرآن کے معروف حدود وشرائط پر اضافہ ہے جو قابلِ توجہ ہے۔

نظمِ قرآن — متوازن نقطۂ نظر:

حاصل کلام یہ کہ فی الجملہ کتاب اللہ میں نظم وترتیب کے اعتراف کے ساتھ سخت گیر نظم قرآن جیسا کہ خاص مکتب فکر کی طرف سے کہا جاتا ہے، اس پر اصرار مناسب نہیں۔ تنہا اسے ہی جس طرح فہم قرآن کی کلید باور کرایا جاتا ہے وہ مبالغہ آمیز ہے۔ تاریخ کے بے لاگ جائزے سے فائدے کے مقابلے میں اس کا نقصان زیادہ نظر آتا ہے۔ اس کے نمائندہ لٹریچر میں سب سے نمایاں تفسیر تدبر قرآن ہے جس کی بے اعتدالیوں کے لیے ایک الگ کتاب کی ضرورت ہے۔ لیکن اس سے بڑی تاریخی غلطی یہ کہ مدرسۃ الاصلاح کو نظم قرآن کے داعی اور وکیل کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ مولانا فراہیؒ بلاشبہ اس مدرسہ کے بہت بڑے محسن ہیں، اس کے اعتراف میں مدرسہ کے اندر ان کے علوم وافکار کے مطالعہ کے لیے ایک مخصوص چیر قائم کی جاسکتی ہے، حدود مدرسہ میں ان کے افکار کا خصوصی حوالہ اور چرچا بھی ہوسکتا ہے جو عین تقاضائے احسان شناسی ہے۔ لیکن یہ انصاف کے خلاف ہے کہ کسی ادارہ کو اس کے دستور اور نصب العین سے ہٹا کر ذاتیات اور شخصیات کے گرد گھمایا جائے۔ پون صدی کے عرصے میں حدیث وفقہ سے بے اعتنائی کے ساتھ اس میں جو کمزوری پیدا ہوئی ہے اس کے تقاضے سے فوری طور پر مادر علمی سے نظم قرآن کے بوجھ کو کم کرنا چاہیے۔ سائنس کی نئی آفت سے

ہٹ کر اس کے پہلے قدم کے طور پر مدرستہ الاصلاح میں اسباق النحو، تحفۃ الاعراب اور امثال آصف الحکیم کی پہلے سے شامل نصاب مولانا فراہیؒ کی کتابوں کے علاوہ 'دلائل النظام' اور 'التکمیل' جیسی دوسری تمام کتابوں کو جو ماضی قریب میں اس میں شامل کی گئی ہیں، انھیں نصاب سے خارج کیا جائے۔ علوم میں زیادہ اصولوں کا چکران کی راہ کی رکاوٹ ہے، اصول فقہ میں غلو اور کتابوں کی کثرت کو اگر بجا طور پر بے اصل اور بے سود 'لغو' کہا گیا ہے[۳۸] تو اصولِ تفسیر کے معاملے کو اس سے مختلف نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ دیگر علوم کے مقابلے کتاب اللہ اصول کی بھول بھلیوں سے اس سے زیادہ بے نیاز ہے۔

مادر علمی کے دستور میں قرآن، حدیث، فقہ اور ادب عربی کے ساتھ شدت اعتناء کی جو بات کہی گئی ہے[۳۹] اسے اسی دائرے میں محدود رکھا جائے۔ قرآن سے شدت اعتناء کو افکار فراہیؒ سے شدت اعتناء کے مرادف قرار نہ دیا جائے۔ مدرستہ الاصلاح کا اصل مابہ الافتخار اس کا رجوع الی القرآن کا پیغام ہے۔ بے اعتدالیوں سے بچتے ہوئے اسی پیغام کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ مدارس عربیہ کا مقصد امت کی متنوع دینی ضروریات کی تکمیل ہے۔ صرف نظم قرآن کی بانسری بجانے سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ مولانا فراہیؒ کے اعتراف کے لیے مادر علمی میں صرف 'دائرہ حمیدیہ' کافی ہے۔ پورے مدرسے کو افکار فراہی کے گرد گھمانا نری بے اصولی اور خلاف انصاف ہے۔ اس پس منظر میں مدرسہ کی مرکزی انجمن طلبہ قدیم کو جو دائرۂ حمیدیہ کا ضمیمہ بنا دیا گیا ہے تو یہ خود اس فورم کے ساتھ بے انصافی اور اس کے قرار دادہ مقاصد کے علی الرغم ہے۔ مدرستہ الاصلاح کے ساتھ سردست اس کی طلبہ قدیم مرکزی بھی اسی طرح اصلاح طلب ہے۔

حواشی و حوالہ جات

[۱] اس کے قائلین میں ایک اپنے وقت کے درویش صفت شیخ الازہر، قواعد فقہیہ کے بیان میں معرکۃ الآرا کتاب 'قواعد الاحکام فی مصالح الانام' کے مصنف شیخ عزالدین عبدالسلام م ۶۶۰ھ، جن کا تذکرہ خود مولانا فراہیؒ نے اپنے مقدمہ تفسیر میں کیا ہے، فاتحہ تفسیر نظام القرآن وتاویل الفرقان بالفرقان / ۲، مطبعۃ الاصلاح، سرائے میر اعظم گڑھ ۱۳۵۷ھ بعد کے لوگوں میں اس سلسلے کا دوسرا نمایاں نام صاحب فتح القدیر قاضی شوکانی م ۱۲۵۰ھ

کا ہے۔ دیکھئے ان کی تفسیر فتح القدیر الجامع بین فنی الروایۃ والدرایۃ من علم التفسیر: ۱/۷۲، ۷۳، دار المعرفۃ بیروت۔

۵۲ اس طبقے کے ممتاز ناموں میں صاحب تفسیر کبیر امام رازی م ۶۰۶ھ، علامہ آلوسی صاحب روح المعانی م ۱۲۷۰ھ اور اردو مفسرین میں مولانا اشرف علی تھانوی صاحب بیان القرآن م ۱۳۶۲ھ صاحب تفہیم القرآن مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو بھی اسی طبقے میں رکھنا مناسب ہے۔ ان حضرات کی تفسیروں میں جا بجا اس التزام کے نمونے دیکھے جا سکتے ہیں۔ مولانا فراہیؒ کے ذکر کردہ صاحب احکام القرآن ابن عربی کو بھی اسی طبقے میں شامل کیا جانا مناسب ہے۔ اسی موقع پر مولانا فراہیؒ نے امام رازی کا بھی تذکرہ کیا ہے، فاتحہ/۵، طبع مذکور۔

۵۳ اس کے مشہور ناموں میں شیخ ابوحیان، برہان الدین بقاعی، ابوبکر نیشاپوری، مخدوم مہائمیؒ اور شیخ ولی الدین ملوی شامل ہیں جن کا فطری طور پر فاتحہ نظام القرآن میں اہتمام سے ذکر ہے، فاتحہ: ا تا ۵، محولہ بالا۔ خیال رہے کہ حضرت مجدد صاحب مہائمی کی تفسیر تبصیر الرحمٰن کو پسند نہیں کرتے جو کتاب اللہ کی تفسیر میں حکماء فلاسفہ کی آراء کو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ برابر کی اہمیت سے بیان کرتے ہیں یہاں تک کہ اس کے مطالعہ کو بھی ضرر سے خالی خیال نہیں کرتے۔ مکتوبات امام ربانی: ۲/۱۵۶۰ مکتوبات ۱۰۱۔ اردو ترجمہ از مولانا محمد سعید نقش بندی، فیصل پبلشنگ ہاؤس، دیوبند ۱۹۸۸ء طبع اول۔

۵۴ اور ان کے ساتھ ان کے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحی حفظہ اللہ نے اپنی تفسیر تدبر قرآن میں اس کا پوری شدت سے التزام کیا ہے اور اس حیثیت سے بالخصوص اردو ذخیرۂ تفسیر میں اس کی امتیازی حیثیت مسلم ہے۔ بعد کی پیڑھی میں دوسرا قابل ذکر نام مولانا عنایت اللہ سبحانی جن کا علامہ فراہی کے نظم قرآن پر پی ایچ ڈی مقالہ البرہان فی علوم القرآن، ضخیم کتاب کی صورت میں منظر عام پر آچکا ہے۔ فراہی مکتب کا یہ خاص امتیاز باور کیا جاتا ہے جس کے مراکز میں مدرسۃ الاصلاح سرائے میر علاوہ اس کے متنی جامعۃ الفلاح بلریا گنج کو بھی بحالات موجودہ اسی طرح شامل کیا جا سکتا ہے۔

۵۵ اس کے نمایاں ناموں میں علامہ ابن قیم م ۷۵۱ھ کی اعلام الموقعین اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی م ۱۱۷۶ھ کی حجۃ اللہ البالغہ، اردو کتابوں میں اس نسبت سے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی م ۱۳۶۲ھ کی 'المصالح العقلیہ للاحکام النقلیہ' بھی قابل ذکر ہے جو بعض اوقات اپنے پیش رووں پر اضافہ کرتی ہے۔

۵۶ مولانا تھانویؒ نے اپنی مذکورہ کتاب کے مقدمہ میں یہ بات کہی گئی صفحات ۲ تا ۴، مطبوعہ ادارہ اشرف العلوم دیوبند ۱۳۶۱ھ اور حجۃ اللہ کے مقدمہ: ۱/۲ میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے۔ کتب خانہ رشیدیہ، دہلی 'المصالح العقلیہ' میں اس موضوع پر دو اور عربی کتابوں مصری فاضل ابراہیم آفندی کی 'اسرار شریعت' اور ایک رسالے 'رسالۂ حمیدیہ' کا بھی تذکرہ ہے۔ صفحات ۴، ۵، محولہ صدر۔

۷ علامہ ابن تیمیہ م ۷۲۸ھ اپنے فتاویٰ میں 'ترتیب السور کان مفوضا الی اجتہادھم'، ترتیب آیات السور منصوص'، فتاویٰ ابن تیمیہ: ۳۹۶، ۴۰۹، ۱۰/۱۴، طبع جدید سعودی عرب، ترتیب عبدالرحمٰن بن قاسم وابنہ محمد۔ اسی کے قائلین میں حضرت امام مالک اور قاضی ابوبکر ابن عربی صاحب احکام القرآن بھی ہیں، لیکن مضبوط بات یہی ہے کہ آیتوں کی طرح سورتوں کی ترتیب بھی توقیفی اور حق سبحانہ وتعالیٰ کی وحی کردہ ہے جس کے قائلین میں ابوجعفر نحاس، ابن الحصار اور حافظ ابن حجر ہیں اور علامہ سیوطی کا واضح رجحان بھی اسی رائے کی طرف ہے۔ ملاحظہ کیجیے: الاتقان فی علوم القرآن: ۱/۶۲، ۶۳، مطبعہ ازہریہ، مصر ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۵ء طبعہ ثانیہ۔

۸ روایت احمد و ابوداؤد بحوالہ: الاتقان/۶۳، محولہ بالا۔ مزید ملاحظہ ہو: قاضی مظہر الدین احمد بلگرامی: عیون العرفان فی علوم القرآن صفحات ۷۸ تا ۸۰، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ دسمبر ۱۹۸۰ء طبع اول تلاوت قرآن میں حضرات صحابہؓ کے دیگر معمولات کے لیے: الاتقان فی علوم القرآن: ۱/۱۰۴، محولہ بالا۔

۹ الاتقان: ۱/۶۲، نیز: ۱۰۴، ۱۰۵۔ آخری آیت کریمہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر 'واتقوا یوما ترجعون فیہ الی اللہ'، نازل ہوئی جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبرئیل نے سورۂ بقرۃ کی آیت ربا اور آیت دین ۲۸۰، ۲۸۲، کے بیچ ۲۸۱ پر رکھنے کے لیے کہا۔ دوسرے ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت کریمہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے صرف سات دن قبل نازل ہوئی، التبیان فی علوم القرآن للصابونی ص۵۵، مکتبہ الغزالی دمشق اور موسستہ مناہل العرفان، بیروت ۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء، طبعہ ثانیہ۔

۱۰ اس سلسلے کا سب سے نمایاں نام ابوحیان اندلسی م ۷۴۵ھ کی 'البرہان فی ترتیب سور القرآن'، مدرسۃ الاصلاح کے کتب خانے میں اس کے مخطوطہ پر مولانا مسعود عالم ندوی ۹ صفر المظفر ۱۳۵۹ھ کا تحریر کردہ یہ نوٹ ہے:—
"المنقول عن النسخۃ الخطیۃ المحفوظۃ فی الخزانۃ الشرقیۃ العمومیۃ بمدینۃ عظیم آباد برقم ۲۱۰۔ نقلہ بعض الطلبۃ بمدرسۃ شمس الہدیٰ وعرضوہ علی الام المنقول عنہا الا انہ بقی فیہ شئ من الاخطاء لم یتمکنوا من تصحیحہا ولم اتفرغ لازالۃ ھٰذہ عسی ان یوفق اللہ اصحاب ھٰذہ النسخۃ للمقابلۃ والطبع"۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا فراہی کے نظم قرآن پر مولانا سبحانی کی مذکورہ عربی کتاب اسی مخطوطہ کا چربہ ہے، اس پس منظر میں ان دونوں کا تقابلی مطالعہ ایک دلچسپی کا موضوع ہے۔

۱۱ قرآنی سورتوں کے جوڑے جوڑے ہونے کا فلسفہ، تفصیل کے لیے: مقدمہ تدبر قرآن ل م، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، طبع سوم ۱۹۷۶ء۔

۱۲ خیال رہے کہ مولانا فراہیؒ سورۂ حج کو مدنی اور ہجرت کے فوراً بعد کی نازل کردہ مانتے ہیں، دلائل النظام،

صفحات ۹۲، ۹۶، الدائرۃ الحمیدیۃ ومکتبہا، طبع اولی ۱۳۸۸ھ۔ البتہ ان کے شاگرد رشید کا اصرار ہے کہ ۳۸ تا ۴۱ چار آیات کے سوا یہ پوری سورہ مکی ہے۔ تدبر قرآن: ۴/۱۲۱، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۱۳۹۶ھ/۱۹۷۶ء زمخشری بھی چھ آیات کے علاوہ باقی پوری سورہ کو مکی مانتے ہیں۔ الکشاف عن حقائق التنزیل: ۳/۲، مصطفیٰ البابی الحلبی واولادہ، مصر، الطبعۃ الاخیرۃ ۱۳۹۲ھ ۱۹۷۲ء۔

۱۳؎ اس موقع پر نظم قرآن سے امت کی غفلت یہود و نصاریٰ کی روش کے مشابہ قرار دیتے ہوئے 'یحرفون الکلم عن مواضعہ (مائدہ: ۱۳)' 'فنسوا حظا مما ذکروا بہ فاغرینا بینہم العداوۃ والبغضاء الی یوم القیامۃ (مائدہ: ۱۴) آیات قرآنی کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ استاذ امام کے اس مضمون کو نقل کرنے کے ساتھ دلائل النظام کے مرتب نے 'کلمۃ الجامع' میں بھی اسی آیت کریمہ کو نقل کرنے کو ضروری خیال کیا ہے۔ دلائل النظام ص۵، محولہ بالا کورانہ تقلید کی اس سے بہتر مثال ڈھونڈنی مشکل ہے۔

۱۴؎ آل عمران: ۱۱۰ ۱۵؎ لن یزال امر ھٰذہ الامۃ مستقیما حتی تقوم الساعۃ او حتی یاتی امر اللہ عزوجل، بخاری جلد ۲ کتاب الاعتصام، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم لاتزال طائفۃ من امتی ظاہرین علی الحق اصح المطابع دھلی۔ نیز مسلم جلد ۱ کتاب الایمان، باب نزول عیسیٰ بن مریم حاکما بشریعۃ نبینا محمد صلی اللہ علیہ وسلم، مطبعۃ عامرہ، مصر۔ اس مضمون کی دیگر احادیث کے لیے مشکوٰۃ المصابیح جلد ۲ کتاب الفتن، باب ثواب ہٰذہ الامۃ، کتب خانہ رشیدیہ دہلی۔

۱۶؎ 'لاتجتمع امتی علی ضلالۃ' روایت، ترمذی وابوداؤد۔ الفاظ ترمذی کے۔ اس کی سند میں کمزوری ہے لیکن امام حاکم نے اس کے دوسرے شواہد نقل کیے ہیں جس سے اس کے مضمون کو قوت مل جاتی ہے۔ وفی سندہ ضعف لکن اخرج لہ الحاکم شواھد، بحوالہ الورقات للجوینی /۲۶ مشمولہ مجموع متون اصولیہ، مکتبۃ الاصلاح سرائے میر، ربیع الاول ۱۴۰۱ھ، طبع اولی۔

۱۷؎ الورقات للجوینی، محولہ بالا۔

۱۸؎ دو جنازوں کے گزرنے پر حضرات صحابہؓ کے دو مختلف ردعمل، جس کی توثیق کرتے ہوئے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں 'شہداء اللہ فی الارض' کی بشارت سے نوازا، بخاری جلد ۱ کتاب الجنائز، باب ثناء الناس علی المیت، نیز مسند احمد بن حنبل: ۲/۲۶۱، ۳/۱۷۹، میمنہ، مصر۔

۱۹؎ فاتحہ نظام القرآن اور حکمۃ الجامع فی دلائل النظام، محولہ بالا در حاشیہ ۱۳۔

۲۰؎ بعض پہلوؤں سے مکتب فراہی کے سب سے ممتاز ترجمان مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ تفسیر سورۂ فیل

کو مولانا فراہیؒ کی نری اپج قرار دیتے تھے۔ اس کی نسبت سے بعض قابل احترام بزرگوں نے جو التباس پیدا کرنے کی کوشش کی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ مولانا ابواللیثؒ سے راقم کا یہ براہ راست استفادہ ہے۔

۲۱؎ انعام: ۴۲، اعراف: ۵۹، ہود: ۲۵، نحل: ۶۳، مریم: ۱۷، مومنون: ۲۳، وغیرہ دیگر آیات۔

۲۲؎ جلالین ۲۱۱/، دارالمعرفۃ، بیروت ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء، طبعہ اولیٰ۔ موضح القرآن ۷۷۲/، تاج کمپنی لاہور۔

۲۳؎ صاحب جلالین نے 'رجز' کی تفسیر 'عذاب' ہی سے کی ہے۔ تفسیر الجلالین ۲۱۱/، محولہ بالا۔

۲۴؎ نیز حم السجدہ: ۱۶ 'فارسلنا علیہم ریحا صرصرا فی ایام نحسات لنذیقہم عذاب الخزی فی الحیوۃ الدنیا ولعذاب الآخرۃ اخزیٰ وھم لاینصرون' نیز ذاریات: ۴۱، ۴۲ 'وفی عاد اذ ارسلنا علیہم الریح العقیم ٥ ما تذر من شئ اتت علیہ الاجعلتہ کالرمیم ٥ تعجب ہوتا ہے کہ مولانا فراہیؒ جیسے ماہر لغت اور اسالیب قرآن کے رمز آشنا کی نگاہ اس طرف کیسے نہیں گئی۔ اپنی تفسیر سورۂ فیل میں جو انھوں نے قمر: ۳۴ کا حوالہ دیا بھی ہے تو وہ 'حاصب' کی تحقیق کے ذیل میں ہے۔ 'ارسلنا علیٰ' کے موقع استعمال سے انھوں نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ تفسیر سورۂ فیل اردو ترجمہ ۶۷/، دائرہ حمیدیہ، طبع دوم۔ قدیم عربی شاعری سے جو انھوں نے اپنے موقف کی تائید کرنے کی کوشش کی ہے تو وہ چند در چند کمزوریوں کی شکار ہے جس کے لیے الگ صحبت درکار ہے۔ جنگ جمل میں دس ہزار سے اوپر اور صفین میں جانبین سے ستر ہزار کے قریب افراد مارے گئے (تاریخ اسلام: ۱/۴۶۰، ۴۸۱ از مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی، تاج کمپنی دہلی) سوال یہ ہے کہ جب ان کی لاشوں کو ٹھکانے لگانے کے لیے آسمان سے چڑیوں کی خصوصی مدد کی ضرورت نہیں ہوتی تو ابرہہ کے لشکریوں ہی کے لیے اس کی ضرورت کیوں پیش آئی جبکہ اس کے مقتولین کی کسی تعداد کی صراحت خود صاحب تفسیر سورۂ فیل نے نہیں کی ہے۔ اہتمام طلب کلمہ گو مسلمانوں کی اس بڑی تعداد میں لاشوں کے مسئلہ کو جب اہل عرب نے حل کر لیا تو غیر مسلم فوج کی لاشوں کے ٹھکانے لگانے کے مسئلے کو تو اس سے بہرحال آسان ہونا چاہئے۔ دوسرے ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ ابرہہ کی فوج کی کل تعداد ساٹھ ہزار تھی، تفہیم القرآن ۶/۴۶۴ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ۱۹۸۳ء طبع سوم۔ الرحیق المختوم ۷۷/، مجلس علمی، علی گڑھ ۱۴۰۸ھ/۱۹۸۸ء، طبع اول۔

۲۵؎ صاحب تفہیم القرآن نے 'صیحۃ' کی ترجمانی جو 'دھماکے' سے کی ہے وہ صحیح نہیں معلوم ہوتی، اردو ترجمہ قرآن مع مختصر حواشی ۱۳۴۹/، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔ دھما کا عربی لفظ 'تفجر' یا 'انفجار' کا ترجمہ ہے۔ اردو مترجمین نے عام طور پر اس کا ترجمہ 'چنگھاڑ' سے کیا ہے، یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ تفسیر عثمانی میں یہ صراحت ہے کہ یہ 'چیخ فرشتے نے ماری تھی جس سے کلیجے پھٹ گئے اور سب چورا ہو کر رہ گئے۔ ترجمہ شیخ الہند م تفسیر عثمانی ۶۸۷/، تاج کمپنی (دہلی)

۲۶؎ مولانا امین احسن اصلاحی حفظہ اللہ اپنی تفسیر تدبر قرآن میں، مزید تفصیل کے لیے ہمارا مضمون 'ترجمان القرآن فراہی کا مسلک حدیث'، تحقیقات اسلامی جنوری ۔ اپریل ۱۹۹۴ء۔

۲۷؎ مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی کی تازہ تصنیف 'حقیقت رجم' ادارہ احیائے دین، بلریا گنج، اعظم گڑھ (یوپی) جسے مجموعہ اغلاط اور مجموعہ التباسات کے علاوہ دوسرا نام نہیں دیا جاسکتا ہے۔ کاش کہ ہمارے بزرگ تنقید اعمیٰ سے ہٹ کر اپنی صلاحیتوں کو دین کی علمی خدمت کے پھیلے ہوئے دوسرے دائروں میں استعمال کرتے۔ تحریک اسلامی سے وابستہ افراد کی اس طرح کی لاطائل علمی دلچسپیاں اور بھی قابل افسوس ہیں۔ مولانا سبحانی نے اپنے اوقات کے ضیاع کے ساتھ دوسرے عالم کے بھی تضیع اوقات کا سامان کیا۔ اس کتاب کے پیدا کردہ فکری انحراف کی اصلاح امت پر بطور فرض کفایہ واجب ہے۔ وفی ذالك فليتنافس المتنافسون۔

۲۸؎ تدبر قرآن: ۶/ ۵۱۴، فاران فاؤنڈیشن، لاہور طبع دوم ۱۴۰۲ھ ۱۹۸۲ء الفاظ ہیں: 'تیسری یہ کہ 'تعزیر' اور 'توقیر' کے الفاظ اللہ تعالیٰ کے لیے موزوں نہیں ہیں، یہ اپنے مواقع استعمال کے لحاظ سے رسول ہی کے لیے موزوں ہیں۔ 'توقروہ' کا لفظ تو اللہ تعالیٰ کے لیے بالکل ہی ناموزوں ہے'۔

۲۹؎ الموافقات للشاطبی: ۱/ ۷۷ ۔ ۸۱، مکتبہ تجاریہ کبریٰ، مصر۔ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے جوامع الکلم میں اس پوری بحث کو ایک جملے میں سمیٹ دیا گیا ہے: العلم ثلاثة اية محكمة او سنة قائمة او فريضة عادلة وما كان سوىٰ ذالك فهو فضل۔ روایت عبداللہ عمرؓ بحوالہ ابوداؤد وابن ماجہ۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب العلم، فصل ثانی کتب خانہ رشیدیہ دہلی۔

۳۰؎ الکشاف عن حقائق التنزیل: ۲/ ۵۳۶، مصطفیٰ البابی الحلبی واولادہ مصر، الطبعۃ الاخیرۃ ۱۳۹۲ھ ۱۹۷۲ء باقلانی جو قرآن کے اعجاز کے دس وجوہ بیان کرتے ہیں ان میں بھی ایک اس کے نظم کو اسی معنیٰ میں قرار دیتے، اعجاز القرآن للباقلانی م ۴۰۳ھ ہامش الاتقان للعلامۃ السیوطی م ۹۱۱ھ: ۱/ ۵۱ محولہ بالا۔ باقلانی نے یہ جو دس وجوہ بیان کیے ہیں۔ زمخشری نے ان سب کو دو جہتوں میں سمیٹ دیا ہے: انه كتاب معجز من جهتين من جهة اعجاز نظمه، ومن جهة ما فيه من الاخبار بالغيوب (الکشاف: ۲/ ۲۳۸، نیز ۲۶۲، محولہ بالا) اصول فقہ میں شریعت کے ماخذ اول کی حیثیت سے کتاب اللہ کی جو تفصیل نظم و معانی سے کی جاتی ہے (مختصر المنار ۱/ ۱، مشمولہ مجموع متون اصولیہ، محولہ صدر) تو یہاں بھی نظم سے مراد فراہی مکتب فکر سے ہٹ کر یہی آیات کا اندرونی ربط اور اس کے لفظ اور ترکیب سے متعلق مسائل ہیں۔

۳۱؎ اس سلسلے کا بہت ہی نمایاں نام صاحب سنن ابوداؤد امام ابوداؤد سجستانی م ۲۷۵ھ کی قرآنیات

پر دوسری دو کتابوں "شریعۃ القرآن" اور "شریعۃ التفسیر" کے علاوہ خاص طور پر ان کی کتاب "نظم القرآن" جسے تلاش و جستجو سے منظر عام پر لانے کو امت پر فرض کفایہ ہونا چاہیے ۔ ملاحظہ کیجئے : طبقات المفسرین : ۱/۲۳۷، دارالکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۰۳ھ/۱۹۸۳ء، طبعہ اولی ۔

۳۱؎ روایت ترمذی و دارمی بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح/۱۸۶، کتاب فضائل القرآن ۔ فصل ثانی ۔ طبع مذکور ۔

۳۲؎ امام ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ، محولہ بالا ۔

۳۳؎ روایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، شرح السنۃ بحوالہ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب العلم ۔ فصل ثانی ۔

۳۴؎ نیز : لقمان : ۲۷، یہاں اور کہف : ۱۰۹ میں کلمات اللہ سے مراد قرآن اور وحی ہے اس کی وضاحت کہف ۲۷، سے ہوتی ہے ۔ واتل ما اوحی الیک من کتاب ربک لا مبدل لکلمتہ ولن تجد من دونہ ملتحدا ۔

۳۵؎ حشر : ۱۰، والذین جاء وامن بعدھم الآیہ سے استدلال کرتے ہوئے سواد عراق کی مفتوحہ زمینوں کو مجاہدین میں تقسیم نہ کرکے ریاست کے ذریعہ اس کے بندوبست کی فاروقی رائے، فقہاء صحابہؓ میں حضرت علیؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کی بھی یہی رائے تھی، بلکہ ابتداءً فاروق اعظمؓ کے سامنے اس کا سجھاؤ انہی حضرات کی طرف سے آیا تھا ۔ کتاب الاموال لابی عبید/۶۱-۶۳ ۔ مکتبۃ الکلیات الازہریۃ ۔ مصر ۱۴۰۱ھ/۱۹۸۱ء، طبعہ ثانیہ ۔

۳۶؎ کتاب اللہ کے الفاظ 'اب' (فاکھۃ وابا : عبس : ۳۱) اور تخوف 'اویاخذھم علی تخوف' : کے سلسلے میں حضرت فاروق اعظمؓ کا ردعمل کہ ان تحقیق میں پڑنا تکلف اور بہت زیادہ عملی ضرورت نہ ہو کر غیر ضروری، الموافقات للشاطبی : ۱/۵۳، ۵۴، محولہ بالا ۔

۳۷؎ تصوف کے اولین بنیادی مراجع سے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح و تفسیر میں حضرات صوفیاء عظام کے اچھوتے اور نادر نکات کو جمع کیا جا سکے تو بہترین تفسیر کے ساتھ حدیث نبویؐ کی لاجواب شرح تیار ہو ۔ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے مسلمان علماء اور اسکالروں کے لیے دعوت سخن ۔

۳۸؎ جامع بیان العلم لابن عبدالبر : ۲/۴۵، ادارۃ الطباعۃ المنیریہ (مصر) دارالکتب العلمیہ، بیروت ۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸ء

۳۹؎ جامع البیان : ۲۷/۶۱، میمنیہ، مصر ۔

۴۰؎ احیاء علوم الدین : ۲/۴۱، مکتبہ تجاریہ کبری، مصر ۔ مطبعۃ الاستقامہ، قاہرہ ۔

۴۱؎ احیاء علوم الدین : ۲/ محولہ بالا ۔

۴۲؎ فتح القدیر للشوکانی : ۱/۲۵۰، دارالمعرفۃ، بیروت

۴۳؎ الاحکام السلطانیہ للماوردی/۱۴۳، مصطفی البابی الحلبی واولادہ، مصر ۱۳۹۳ھ/۱۹۷۳ء، طبعہ ثالثہ ۔

۴۴ھ فراہیات کے پھیلے ہوئے لٹریچر میں جابجا اس کے نمونوں کے علاوہ بالخصوص 'اساس دین کی تعمیر' میں نماز اور صبر کی بحث۔ مصنفہ مولانا صدرالدین اصلاحی، مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔ ۴۵ھ احیاء: ۲۸۴/۱، ۲۸۵،

۴۶ھ ردالمحتار مع الدر المختار: ۱/۵۵۱، مطبعۃ عثمانیہ، مصر إن القیاس بعد الاربعماۃ منقطع الخ

۴۷ھ مقدمہ ابن خلدون ۴/۴۹۴، مطبعۃ بہیہ مصر (بدون سنہ)

۴۸ھ دستور العمل مدرستہ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ منظور کردہ ۳۱ دسمبر ۱۹۲۸ء مطبوعہ حمیدیہ پریس سرائے میر۔ دفعہ ۴۔ کے الفاظ ہیں: "اصلی مقصد اس مدرسہ کا مسلمانوں کی مذہبی اور دنیوی تعلیم ہے، اور بوقت توسیع مذہبی تعلیم کو مقدم رکھا جائے گا۔" ص۲ آگے دفعہ ۵ کے تحت انتظام تعلیم میں مدرسہ کی خصوصیات کے بیان کا پہلا نکتہ ہے۔ (الف) "قرآن وحدیث وفقہ وادب عربی کی طرف شدت اعتناء"

فاعتبروا یا اولی الابصار۔

اعلان ملکیت سہ ماہی تحقیقات اسلامی۔ فارم ۴ رول ۸

۱۔ مقام اشاعت: پان والی کوٹھی۔ دودھ پور، علی گڑھ یوپی

۲۔ نوعیت اشاعت: سہ ماہی

۳۔ پرنٹر پبلشر: سید جلال الدین عمری

۴۔ قومیت: ہندوستانی

پتہ: پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ۔ یوپی

۵۔ ایڈیٹر: سید جلال الدین عمری

پتہ: پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ، یوپی

۶۔ ملکیت: ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی

پان والی کوٹھی، دودھ پور۔ علی گڑھ، یوپی

بنیادی ارکان کے اسمائے گرامی

(۱) مولانا محمد فاروق خاں (صدر) ۱۳۵۲، بازار چتلی قبر، دہلی ۶

(۲) جناب سید یوسف (رکن) ابوالفضل انکلیو نئی دہلی

(۳) ڈاکٹر فضل الرحمن فریدی۔ فریدی ہاؤس سر سید نگر علی گڑھ

(۴) جناب امین الحسن رضوی (رکن) دلشاد گارڈن نئی دہلی۔

(۵) ڈاکٹر محمد رفعت، شعبہ فزکس، جامعہ ملیہ۔ نئی دہلی۔

(۶) مولانا کوثر یزدانی ۱۳۵۲۔ بازار چتلی قبر۔ دہلی۔

(۷) ٹی۔ کے عبداللہ صاحب الاتھن کنڈی ہاؤس، پیری کالی کٹ

(۸) ڈاکٹر حمید اللہ۔ مزمل منزل کمپلیکس۔ علی گڑھ

(۹) ڈاکٹر احمد سجاد۔ بریاتو ہاؤسنگ سوسائٹی، کالونی طارق منزل رانچی

(۱۰) ڈاکٹر عبدالحق انصاری۔ امریکہ

(۱۱) سید جلال الدین عمری (سکریٹری) مزمل منزل علی گڑھ

پان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ۔

مندرجہ معلومات میرے علم ویقین کی حد تک بالکل درست ہیں۔

پبلشر: سید جلال الدین عمری